اسلام کا معاشی نظریہ

محمد مظہر الدین صدیقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

اسلام کا معاشی نظریہ

محمد مظہر الدین صدیقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

بار اوّل ۱۹۵۴ء

بار دوم ۱۹۷۸ء

تعداد ۱۱۰۰

طابع فالکن پریس لاہور

ناشر محمد اشرف ڈار (معتمد اعزازی)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

فہرست مضامین

تمہید

اسلام کے معاشی نظریہ پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مسلمانوں کی تشنگی پورے طور پر دور نہیں ہوسکی اور معاشی امور کے متعلق مسلمانوں کے ایک کثیر التعداد طبقہ میں ابھی تک ذہنی الجھاؤ باقی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں جو معاشی احکام پائے جاتے ہیں اور جن کے مجموعہ کو اسلام کے معاشی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ عہدِ رسالت کے مخصوص حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جاری کیے گئے تھے اور ان خصوصی مسائل کو حل کرنے کے لیے وجود میں آئے تھے جو اس زمانہ میں درپیش تھے۔ بلاشبہ ان جزوی احکام کی تہ میں بعض بنیادی اصول بھی ملتے ہیں جن کا ہر زمانہ کے حالات پر اطلاق کیا جاسکتا ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمیں انہی بنیادی اصولوں سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں ایک دائمی صداقت پائی جاتی ہے جو خارجی احوال و تغیرات کے باوجود اپنی جگہ اٹل ہے۔ لیکن اسلام کے ان بنیادی معاشی اصولوں اور اس کے عام معاشی مزاج

سے قطع تعلق کر کے اگر جزوی احکام اور فروعی قوانینِ مذہب کو اس زمانہ کے حالات اور مسائل پر چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کوشش نہ صرف بے سود اور ناکام ہو گی بلکہ اس سے خود اسلام کے مقصد اور منشا کو صدمہ پہنچے گا اور خواہ لفظی حیثیت سے ہم مذہبی احکام پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب ہو جائیں لیکن معنوی اور روحانی نقطۂ نظر سے ہمارا یہ عمل مزاج اسلام کے منافی ہو گا۔ کیونکہ ایک دائمی مذہب کی حیثیت سے جو ہر زمانہ کے متغیر حالات کا ساتھ دیتا ہے اسلام نے ہمارے لیے کوئی مکمل اور تفصیلی معاشی نظام وضع نہیں کیا ہے جو بدلے ہوئے حالات میں ہمارے کام آسکے بلکہ اس نے چند اصولی احکام اور بنیادی قوانین کے ذریعہ ہماری رہنمائی کی ہے تاکہ ہم ان کے مطابق ہر زمانہ میں اپنی معاشی زندگی کا تفصیلی خاکہ مرتب کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے انسانی ضروریات اور انسانی زندگی کے مسائل بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ نیز اس اختلاف احوال کے باعث ایک مخصوص دور میں جو جزوی احکام و قوانین سوسائٹی کے کام آتے ہیں آنے والے دور میں وہی احکام و قوانین بلا حذف و ترمیم ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی مذہب جو انسان کی ابدی اور دائمی ہدایت و رہنمائی کے لیے آیا ہو زندگی کے کسی دائرہ میں قانون کا کوئی ایسا مکمل نظام نہیں عطا کر سکتا جو حالات کی تبدیلیوں سے

قطعاً متاثر نہ ہو سکے یا جس میں بلحاظ اقتضائے وقت ترمیم و تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ البتہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے مخصوص دور کے لیے تو تفصیلی قوانین و ضوابط مرتب کر دے لیکن آئندہ کے لیے صرف اساسی اصولوں اور بنیادی احکام کی توضیح و تشریح پر اکتفا کرے۔ تاکہ زمانہ مابعد میں جب حالات بدل جائیں تو انھی اصولی احکام اور اسی بنیادی تصورِ حیات کے مطابق جس پر اس کے تفصیلی قوانین مبنی ہوتے ہیں آئندہ نسلیں اپنے مناسبِ حال قوانین وضع کریں۔ اس نقطۂ نظر سے مذہب کے اس پہلو میں کوئی قطعیت یا دوام نہیں ہے جس سے جزوی احکام اور فروعی قوانین متعلق ہوتے ہیں لیکن جن اصولوں پر یہ احکام و قوانین مبنی ہوتے ہیں اور جس مخصوص تصورِ حیات سے وہ اخذ کیے جاتے ہیں وہ قطعی دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ بالکل یہی حال اسلام کے معاشی نظام کا بھی ہے۔ اسلامی نظام معیشت سے اگر وہ اصول و مبادی مراد ہیں جن سے اس کے جزوی احکامِ معیشت اور تفصیلی معاشی قوانین ماخوذ ہیں تو یہ نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر اسلامی نظامِ معیشت کے معنی یہ لیے جائیں کہ آج کل کے زمانہ میں جب کہ ہمارے حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور ہمارے مسائل کی نوعیت مختلف ہو گئی ہے وہ جزوی فقہی احکام اور تفصیلی قوانین جو عہد اسلام میں جاری اور نافذ تھے من و عن ہماری زندگی پر چسپاں کر دیے جائیں تو یہ نقطۂ نظر ناقص ہے اور اس طرح کی کوشش کا انجام بجز ناکامی کے اور کچھ نہ

ہوگا۔ لہٰذا اسلام کے معاشی نظریہ سے ہم وہ قوانین و ضوابط اور جزوی احکام مراد نہیں لیتے ہیں جو عہدِ نبوت کے مخصوص مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شارع علیہ السلام نے وضع کیے تھے بلکہ اسلام کے معاشی نظریہ سے وہ بنیادی اصول وہ طرزِ فکر اور روحانیت و اخلاق کا وہ زاویہ نگاہ مراد ہے جن پر عہدِ رسالت کے تفصیلی ضوابط اور فروعی احکام مبنی تھے۔ اس کتاب میں ہم عہدِ جدید کے معاشی مسائل پر اسلام کے ان بنیادی اور دائمی اصولوں کا اطلاق کرنے کی کوشش کریں گے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دو انتہا پسند گروہ پائے جاتے ہیں جنھوں نے اسلام کی معاشی تعلیمات کے بارے میں دو متضاد نقاط نظر اختیار کیے ہیں۔ ان مخالف گروہوں کی قلمی آویزش نے ہمارے معاشی مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ ایک گروہ اشتراکیت زدہ مسلمانوں کا ہے جو روس کے معاشی نظام اور اشتراکی تحریک کی سیاسی کامیابی سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات اور اشتراکیت کے نظم معیشت میں کوئی فرق نہیں ہے اور معاشی امور میں اشتراکی روس کی انتہا پسندی مزاج اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ یہ لوگ اسلام کی تعلیمات اور اس کے منشا کو سمجھے بغیر اشتراکیت اور اسلام کی جزوی مشابہتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ ان دونوں نے انسان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی کا ایک ہی نقشہ مرتب کیا ہے اور اگر ان کے درمیان کچھ فرق ہے تو

وہ محض اختلافِ حالات کا نتیجہ ہے۔ اسلام کو وہ معاشی وسائل، انتظامی سہولتیں اور فنی ترقیاں میسر نہ تھیں جو آج کے زمانہ میں اشتراکی روس کو حاصل ہیں۔ اگر اسلام اس زمانہ میں پیدا ہوتا یا اُسے وہ مواقع حاصل ہوتے جو فی زمانہ حکومتوں کو حاصل ہیں تو وہ بھی وہی کچھ کرتا جو لینن اور اسٹالن نے روس میں کیا۔ اس کے بالمقابل ایک اور گروہ ہے جو اسلام کے جزوی احکام اور فروعی قوانین کو بھی ویسا ہی ابدی اور ناقابلِ تغیر سمجھتا ہے جیسا کہ اصول دین کو، اور ان احکام وضوابط اور قوانین میں کسی تبدیلی، ترمیم یا تجدید کو برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ حالاتِ زمانہ کی تبدیلی سے ہمارے مسائل کی نوعیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اور اسلام نے زمین، جائداد اور ملکیت کے بارے میں جو قوانین اپنے عہد میں وضع کیے تھے وہ من وعن آج بھی قابلِ نفاذ ہیں۔ گویا کہ اسلام ایک آہنی چوکھٹا ہے جسے ہر مقام، ہر ملک اور ہر زمانہ میں بلا لحاظ حالات ومقتضیات انسان کی اجتماعی زندگی پر کس دیا جاسکتا ہے۔ اسلام کے اس بے لچک، جامد اور تقلیدی تصور کے تحت یہ لوگ یہاں تک کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ جن امور کی اجازت اسلام نے اپنے زمانہ میں بلحاظ مصالح دے رکھی تھی وہ سب آج بھی جائز ہیں۔ مثلاً ان لوگوں کے خیال میں اگر موجودہ زمانہ کے حالات میں رسمِ غلامی کو پھر تازہ کرنے کی کوشش کی جائے تو اسلامی حکومت کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ قانوناً اس کوشش کو روک دے یا ایسی سرگرمیوں کا انسداد کرے جن کا

مقصد نظام غلامی کا احیا ہو۔ اس طرح یہ لوگ دعوی کرتے ہیں کہ چونکہ اسلام نے بعہد رسالت اور خلافت راشدہ بڑی بڑی جاگیروں اور زمینداریوں کو قائم رکھا تھا اس لیے موجودہ دور میں بھی جبکہ ملکیت زمین کے لامحدود حق کی وجہ سے ملک کی اسی فی صد آبادی نیم غلام کاشتکاروں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی ہے اور زمیندار اور جاگیردار اپنی زمینات کے انتظام سے بے پرواہو کر داد عیش دینے میں مصروف ہیں ان جاگیروں اور زمینداریوں کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔
غرض کہ یہ دونوں مکاتب خیال اعتدال و توسط کی راہ ترک کر کے انتہا پسندی میں مبتلا ہیں۔ پھر ان دونوں کی بحث و تکرار سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ الجھن پیدا ہو گئی ہے کہ آخر معاشی امور میں اسلام کی ہدایات کیا ہیں اور موجودہ حالات میں اگر اسلامی اصولوں پر عمل کیا جائے تو معاشی زندگی کا نقشہ کیا ہو گا۔ آیا اسلام کا معاشی نظام کچھ فرق کے ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مترادف ہو گا یا وہ اشتراکیت کے اس نظریہ پر معاشی زندگی کی عمارت بلند کرے گا کہ بجز اسٹیٹ کے، سرمایہ اور زمین کا کوئی مالک نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں، کیا اشتراکیت کی طرح اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کی کثرت کو مٹا کر ایک واحد سرمایہ دار اور جاگیردار کی تخلیق کی جائے جس کی معاشی اجارہ داری اتنی لا انتہا اور غیر محدود ہو کہ اس سے اختلاف کرنے کے بعد کسی شخص کو زندگی اور رزق کے وسائل نہ مل سکیں اور کوئی فرد اپنی عقل و ضمیر کی آزادی نہ قائم رکھ سکے۔

ان حالات میں اس امر کی توضیح کرنا بے حد ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی اصولوں کا اطلاق اس زمانہ میں کیونکر عمل میں آئے گا۔ لیکن یہ توضیح اسی صورت میں ہماری ذہنی الجھنوں کو دور کر سکے گی جب ہم یہ سمجھ لیں کہ عہدِ اسلام کے معاشی حالات اور عہدِ جدید کے معاشی حالات میں کیا فرق ہے۔ اسلام کو عہدِ رسالت نیز عہدِ خلافتِ راشدہ میں جن مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑا تھا ان کی نوعیت کیا تھی اور فی زمانہ ہمارے معاشی مسائل کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں موجودہ عہد کے دو بڑے معاشی نظامات کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالنی پڑے گی جن کی آویزش ہماری ذہنی الجھنوں کا موجب ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ بلحاظ اختلاف حالات اسلامی اصولوں پر اس زمانہ میں کیسے عمل کیا جائے گا۔

موجودہ معاشی نظامات

موجودہ دَور کے دو اہم معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت ہیں۔ ان کے اصول اور طریق کار میں بڑا شدید اختلاف ہے جس کی وجہ سے عہدِ جدید کے معاشی مسائل میں ایک مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت تین بنیادی اصولوں پر معاشی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ اولاً وہ اشیا کی قیمتوں کا تعین ایک خاص طریقہ پر کرتا ہے جس کے تحت طلب اور رسد کے توازن سے ہر شے کی قیمت معین ہوتی ہے۔ دوسرا بنیادی اصول جس پر نظام سرمایہ داری مبنی ہے آزاد مسابقت کا اصول ہے۔ اس کی رو سے ہر فرد کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ معاشرہ کو اشیائے مطلوبہ فراہم کرکے اس کا معاوضہ اور نفع حاصل کرے۔ اس کا تیسرا بنیادی اصول ذاتی ملکیت کا قانون ہے جس کی بنا پر تمام افرادِ معاشرہ کو اس امر کی اجازت اور آزادی ہے کہ جتنی ملکیت چاہیں حاصل کریں اور اس سے جتنا چاہیں نفع اٹھائیں۔

قیمتوں کے تعین کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن اشیا سے انسانی ضروریات پوری ہوتی ہیں وہ عموماً محدود مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں

سے بعض اشیا ایسی ہیں کہ ان کی مقدار میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً زمین یا کسی مشہور تصنیف کا قلمی نسخہ یا کسی نامور مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر۔ ایسی اشیا کی قیمتوں کا تعین بالکلیہ ان کی مانگ یا طلب پر ہوتا ہے کیونکہ ان کی رسد کی مقدار میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اکثر اشیا کی پیداوار گھٹائی یا بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی اشیا میں طلب اور رسد دونوں تعینِ قیمت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کسی شے کی مانگ یا طلب میں اضافہ ہو جائے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اور اس شے کے تیار کرنے والوں کو زیادہ نفع ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اس شے کو زیادہ مقدار میں تیار کرتے ہیں بلکہ دوسرے اشخاص یا کمپنیاں یہ دیکھ کر کہ اس کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے اس شے کی تیاری میں اپنا سرمایہ لگا دیتی ہیں۔ پھر جب اشیائے مطلوبہ اضافۂ پیداوار کے باعث زیادہ مقدار میں تیار ہونے لگتی ہیں تو ان کی قیمتیں بھی حدِ اعتدال پر آ جاتی ہیں کیونکہ طلب میں جتنا اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے رسد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اضافۂ رسد کے ساتھ ان اشیا کی مانگ بھی بڑھتی رہے تو قیمتیں ایک حالت پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں لیکن اگر مانگ میں مزید اضافہ نہ ہو اور پیداوار مسلسل بڑھتی رہے تو قیمتیں گھٹنے لگتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اشیا کے تیار کرنے والوں کا نفع کم ہو جاتا ہے اور وہ پیداوار میں کمی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ زائد از ضرورت کارخانوں کو بند کر دیتے ہیں، ملازمین اور مزدوروں

کی تعداد میں تخفیف کر دیتے ہیں اور اپنا سرمایہ ان دیگر اشیا کی تیاری میں لگاتے ہیں جن کی مانگ زیادہ ہو۔ اس طرح طلب اور رسد کے باہمی عمل اور ردِ عمل سے سرمایہ دارانہ نظام میں اشیا کی قیمتوں کا تعین ہوتا ہے اور اس امر کا تصفیہ کیا جاتا ہے کہ کون سی شے کس مقدار میں تیار کی جائے۔ سرمایہ داری کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ قیمتوں کے تعین کا یہی فطری طریقہ ہے کیونکہ اس میں مصنوعی طریقہ سے کسی شے کی قیمت نہیں مقرر کی جاتی ہے اور نہ کسی خارجی طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اشیائے مطلوبہ کی پیداوار کو گھٹانے اور بڑھانے کا یہ طریقہ جسے سرمایہ دار فطری قرار دیتے ہیں بعض وجوہ سے اجتماعی مفاد کے حق میں سخت خطرناک ثابت ہوا ہے۔ جس زمانہ میں تجارت اور صنعت و حرفت کا دار و مدار مقامی منڈیوں پر تھا اور ان منڈیوں نے بین الاقوامی وسعت نہیں اختیار کی تھی، طلب اور رسد کے اضافہ میں واقعی تناسب قائم رہتا تھا۔ صناعوں کے لیے بہت آسان تھا کہ جوں ہی کسی شے کی مانگ یا طلب میں اضافہ ہو وہ اس کی پیداوار بڑھا دیں اور طلب میں کمی کے ساتھ پیداوار میں تخفیف کر دیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ تجارت اور صنعت دونوں کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شے کی مانگ میں اضافہ ہو جائے تو فوری طور پر اس کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو اہلِ صنعت کو

مانگ میں اضافہ کا احساس کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ دوسرے نئے کارخانے بنانے، نئی مشینری خریدنے یا تیار کرنے اور نئے مزدوروں کی بھرتی کرنے میں کافی مدت گزر جاتی ہے۔ ان وجوہات سے مانگ میں اضافہ ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جب ایک مرتبہ طلب میں اضافہ کے باعث اہل صنعت اپنا سرمایہ اور مشینری کسی خاص شے کی تیاری میں لگا دیتے ہیں تو پھر ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ طلب میں کمی ہو جانے کی صورت میں پیداوار گھٹا سکیں۔ کیونکہ ایک صنعت میں لگے ہوئے سرمایہ کو دوسری طرف منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح اہل صنعت کو مانگ میں اضافے کا احساس کرنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے اسی طرح مانگ میں کمی واقع ہونے کی صورت میں بھی انھیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ اب بازار سرد پڑنے لگا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر تو اس شے کی مانگ گرتی جاتی اور ادھر اس کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد اہل صنعت محسوس کرتے ہیں کہ ان کی پیداوار کی طلب میں کمی واقع ہو چکی ہے، تب بھی ان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اس درمیان میں وہ شے مطلوبہ کی جو مقدار تیار کر چکے ہیں اس کی نکاسی کے لیے کیا تدبیر کریں۔ اس دشواری کے علاوہ ایک مشکل یہ بھی پیش آتی

نظام آزاد مسابقت پر مبنی ہے، اس لیے ایک ہی صنعت میں متعدد حریف بر سر مقابلہ ہوتے ہیں۔ مانگ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی ہر حریف کارخانہ دار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ پیداوار میں جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ اضافہ کر کے نفع کمانے میں دوسروں پر سبقت لے جائے۔ اس طرح پیداوار کی کثرت ہو جاتی ہے اور طلب و رسد میں توازن نہیں رہتا ہے۔ اشیائے مطلوبہ کی ایک کثیر اور وافر مقدار کو بازار میں فروخت کرنا ایک امر دشوار بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسد میں غیر معمولی اضافہ کے باعث قیمتیں تیزی سے گرنے لگتی ہیں اور جیسے ہی یہ عمل شروع ہوتا ہے ہر کارخانہ دار یہ کوشش کرتا ہے کہ جلد سے جلد پیداوار میں تخفیف کر دے۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو بڑی تعداد میں کارخانے بند ہونے لگتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی اکثریت بیکار ہو جاتی ہے اور منڈیوں کی گرم بازاری اچانک سرد بازاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ عمل جسے تجارتی چکر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس میں کثرت پیداوار کے باعث بالآخر سرد بازاری پیدا ہوتی ہے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا ایک بڑا روگ ہے جسے رفع کرنے کی کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہوئی ہے۔

ایک طرف، تو منڈیوں میں مانگ کے اضافہ اور کمی کے اثرات اتنی دیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بعض اشیا مثلاً تمسکات (STOCKS

AND SHARES) کی منڈیاں اتنی ذی حس واقع ہوئی ہیں کہ ان میں ذرا سی تبدیلی کا فوری اور غیر معمولی اثر ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے تخمین کرنے والوں (SPECULATORS) کو مصنوعی طریقوں سے قیمتوں میں کمی یا زیادتی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ حالانکہ قیمت میں اس تخفیف یا اضافہ کا طلب اور رسد کی حقیقی تخفیف یا اضافہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عمل اس طرح سے واقع ہوتا ہے کہ بعض ہوشیار لوگ جو تجارت اور صنعت و حرفت کے نبض شناس ہوتے ہیں اپنے تمسکات اور حصص سے زائد منافع کمانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی خاص شعبۂ صنعت میں پیداوار کی مانگ بڑھ رہی یا بڑھنے والی ہے اور اس کی وجہ سے اس صنعت کو زیادہ نفع ہونے کی توقع ہے تو وہ اس کے تمسکات اور حصص بڑی تعداد میں خرید لیتے ہیں تاکہ آئندہ چل کر ان سے خوب نفع اٹھائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان حصص اور تمسکات کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جن کمپنیوں کے حصص کی خریداری اس طرح عمل میں آتی ہے ان کی شرح منافع میں کوئی حقیقی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صرف آئندہ اضافہ کی توقع ہوتی ہے۔ اس طرح بعض حصص اور تمسکات کی بڑھی ہوئی مانگ کے باعث ان کی قیمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس قیمت اور اصل (PRINCIPAL) یا سرمایہ میں جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں کوئی تناسب

نہیں رہتا ہے۔ اسی طرح بعض مخمّنوں (SPECULATORS) کے بے جا اندیشوں اور غیر ضروری خدشات کی وجہ سے حصص اور تمسکات کی قیمتوں میں بے انتہا تخفیف بھی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ بعض وقت مخمّن یہ پیش قیاسی کرتے ہیں کہ کسی خاص شے کی مانگ گھٹنے والی ہے اور جو صنعتیں اس شے کی تیاری میں مصروف ہیں ان کے منافع میں کمی واقع ہونے کا احتمال ہے۔ اس اندازہ کی بنا پر ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے خرید کردہ حصص و تمسکات کو اس وقت سے پہلے فروخت کر دیں جبکہ ان کی قیمتیں گھٹ جائیں گی اور اس طرح اپنے آپ کو نقصان سے محفوظ کر لیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کے قبضہ میں ایک خاص کمپنی کے بیس حصص اور تمسکات ہیں اور وہ اندازہ کرتا ہے کہ جس کمپنی کے یہ تمسکات ہیں اس کے منافع میں آئندہ کمی واقع ہو گی اور اس کے ساتھ ہی ان حصص اور تمسکات کی قیمت بھی گر جائے گی تو محض اس قیاس کی بنا پر وہ اپنے تمام حصص و تمسکات بازار میں لا کر فروخت کر دیتا ہے۔ ایسے ہی اور بہت سے لوگ اس کی دیکھا دیکھی اپنے حصص و تمسکات فروخت کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی قیمتیں اچانک گرنے لگتی ہیں۔ اس طرح محض قیاسات اور مفروضات کی بنا پر کمپنیوں کی مالی ساکھ متاثر ہو جاتی ہے جس سے ان کو شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسد اور طلب کے

ذریعہ قیمتوں کے تعیین کا طریقہ جس پر نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے بالکل بے خطا نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی خرابیاں موجود ہیں۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کا دوسرا بنیادی اصول یعنی آزاد مسابقت کا طریقہ بھی عملاً ناقص ثابت ہو رہا ہے کیونکہ جدید سرمایہ داری میں اجارہ داری کی جانب قوی رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض وقت ایک ہی صنعت میں بہت سے حریف برسرِ مقابلہ ہوتے ہیں پھر ان میں سے کوئی ایک اپنے تمام حریفوں پر غالب آجاتا ہے اور اس خاص شعبۂ صنعت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بہت سے برسرِ مقابلہ حریف آپس کی رقابت کے نقصان کو محسوس کر کے باہمی اشتراکِ عمل کی تجویزوں پر غور کرتے ہیں اور بسا اوقات اشتراکِ عمل کی ان تجاویز پر عمل کرنے سے بہت سے صنعتی ادارے آپس میں متحد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس اتحاد میں کمزور اداروں اور کمپنیوں کا انفرادی وجود عملاً ختم ہو جاتا ہے یا ان کی حیثیت ایک متحدہ ادارہ کی ذیلی شاخوں کی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے جو ادارہ یا کمپنی قوی اور با اثر ہوتی ہے وہ ساری صنعت پر چھا جاتی ہے اور دوسرے اداروں یا کمپنیوں کے تمام مالی اور انتظامی اختیارات کو سلب کر لیتی ہے۔ جب اس طرح متعدد صنعتوں پر ایک یا دو اداروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی تیار کردہ اشیا کی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں، اور چونکہ

میدانِ صنعت میں ان کا کوئی حریف یا مدِ مقابل نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ ان بڑھی ہوئی قیمتوں پر مال بیچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری اور اجارہ داری کے درمیان کوئی لازمی تضاد نہیں ہے اور اس نظام میں اجارہ داری کی اتنی گنجائش ہے کہ آزاد مسابقت کا اصول باطل ہو سکتا ہے اور افراد کی تجارتی، صنعتی اور معاشی آزادی سلب کی جا سکتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے تازہ ترین دور میں اس کے اندر بعض اور خصوصیات بھی پیدا ہو رہی ہیں جو بڑی بڑی خرابیوں کی موجب ہیں۔ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں سرمایہ لگانے والے اور صنعتی کاروبار انجام دینے والے اشخاص الگ نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سرمایہ دار اپنے صنعتی کاروبار سے ذاتی طور پر دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اپنے صنعتی ادارہ کی پالیسی خود ہی وضع کرتا تھا، پھر اس پالیسی کو نافذ بھی وہی کرتا تھا نیز کارخانوں کی نگرانی اور انتظام کا کام بھی کرتا تھا۔ اپنی مصنوعات کی خوبی یا خرابی کا وہ آپ ذمہ دار ہوتا تھا۔ کارخانوں کی پیداوار میں اضافہ یا کمی کرنے کا تصفیہ بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ غرض کہ اسے صنعت کے عملی کاروبار سے ذاتی طور پر دلچسپی ہوتی تھی۔ لیکن یہ صورتِ حال اب باقی نہیں رہی ہے۔ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے رواج کے بعد صنعتوں کے لیے بہت بڑی مقدار میں سرمایہ کی ضرورت

محسوس ہونے لگی جس کی فراہمی ایک یا دو اشخاص کے بس کی بات نہیں۔ اب کسی صنعتی ادارہ کو چلانے کے لیے بہت سے اہلِ سرمایہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ معمولی لوگ بھی اگر ان کے پاس کچھ جمع جتھا ہو کمپنیوں کے حصص خرید کر ان میں اپنا سرمایہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ان حصہ داروں کو جو صنعت کے لیے سرمایہ بہم پہنچاتے ہیں اس کے عملی کاروبار کا نہ تو کوئی تجربہ ہوتا ہے اور نہ انھیں انتظامی اور فنی مسائل سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسی کمپنیوں کا انتظام چند ڈائریکٹروں یا منتظمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور عام حصہ داروں کو خبر تک نہیں ہوتی ہے کہ جس کمپنی میں انھوں نے سرمایہ لگایا ہے اس کے معاملات کس طرح سرانجام پا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو ایک ہی شخص کئی کمپنیوں کا حصہ دار بن سکتا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ان تمام کمپنیوں کے کاروبار سے دلچسپی لے جن میں اس کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ دوسرے اس کا لگایا ہوا سرمایہ اتنا قلیل ہوتا ہے کہ اسے کسی مخصوص کمپنی کے اندرونی امور سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ یہ تو ہوا چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا حال۔ بڑے بڑے سرمایہ دار جن کا کروڑوں روپیہ کمپنیوں میں لگا ہوتا ہے انھیں بھی صنعت کے عملی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ بالعموم یہ لوگ صنعت کے انتظامی اور فنی امور کی دیکھ بھال کا کام چند تنخواہ دار منتظمین (-ENTREP

(RENEURS) - کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اکثر صورتوں میں ایک ہی شخص کئی کمپنیوں کا ڈائریکٹر ہوتا ہے، اور سب کے معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ اسے ان کمپنیوں سے صرف ان کے مالیاتی امور کی حد تک دلچسپی ہوتی ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمپنیوں کا غالب حصہ دار بن جائے اور ان کی مالیات پر قابو حاصل کرے یا متفرق کمپنیوں کو آپس میں اس طرح متحد اور ضم کر دے کہ ہر کمپنی کا مالی نظم و نسق اس کے ہاتھ میں آجائے۔ غرض کہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی دولت اور سرمایہ میں اضافہ کرتا جائے اور وہ بھی اس طرح نہیں جیسے کہ ابتدائی زمانہ میں سرمایہ دار کرتے تھے۔ یعنی صنعتوں کو فروغ اور ترقی دے کر یا ان کے اندر انتظامی اور فنی اصطلاحات جاری کر کے بلکہ محض اپنی مالی طاقت کے زور اور کمپنیوں کے اتحاد و انضمام کے ذریعہ۔ اس طرح صنعت اور سرمایہ میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے اور صنعت کے مختلف شعبوں پر ایسے ساہوکاروں (FINANCIERS) کا قبضہ ہو گیا ہے جنھیں صنعت کے داخلی انتظام اور فنی امور کا نہ کوئی تجربہ ہوتا ہے اور نہ کوئی دلچسپی۔ نہ ہی ان ساہوکاروں کو اس سے غرض ہوتی ہے کہ صنعتوں کی کارکردگی میں اضافہ ہو، اور ان میں نئی اصلاحات رائج ہوں۔ یہ لوگ صرف صنعت کو روپیہ فراہم کر دیتے ہیں اور نفع کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

صنعت کے حقیقی مفاد اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے مفاد میں تصادم ہونے لگا ہے۔ پھر چونکہ صنعتی اداروں اور کمپنیوں کے لیے بڑی مقدار میں سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اہلِ صنعت ان ساہوکاروں کی امداد سے مستغنی کبھی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس طرح صنعت و حرفت کی ضروریات اور مصالح ساہوکاروں کے ذاتی مصالح سے قدم قدم پر متصادم ہونے لگے ہیں کیونکہ اس طبقہ کو صنعت کے مستقبل سے زیادہ اپنے منافع سے دلچسپی ہوتی ہے جو کہ صنعتی ترقی کے لیے انتہائی مضرت رساں اور تباہ کُن ہے۔

جس طرح نظامِ سرمایہ داری ذاتی ملکیت، آزاد مسابقت اور رسد و طلب کے ذریعہ قیمتوں کے تعین پر مبنی ہے، اسی طرح اشتراکی نظام اجتماعی ملکیت اور منصوبہ بندی کے دو گونہ اصولوں پر قائم ہے۔ اجتماعی ملکیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ اشتراکی نظام میں افراد کو ذاتی ملکیت کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے لیکن اس حق کو نہایت درجہ محدود اور تنگ کر دیا گیا ہے۔ روزمرہ کی ضروریات سے تعلق رکھنے والی اشیا مثلاً گھر، موٹر، فرنیچر اور کپڑوں وغیرہ کو اجتماعی ملکیت کے قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اشتراکی نظام میں جملہ ذرائع پیداوار مثلاً زمین، کارخانے اور مشینری وغیرہ افراد کی ذاتی ملکیت سے خارج ہوتے ہیں اور ان تمام چیزوں کو اسٹیٹ کی ملکیت قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بیرونی اور داخلی تجارت نیز بنک بھی افراد کے ہاتھوں سے نکل کر اسٹیٹ کے

قبضہ میں آجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جملہ وسائل معاش اور پیدائش دولت کے سارے ذرائع اسٹیٹ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان وسائل کو کام میں لاتے ہیں، کارخانوں کا انتظام اور نگرانی کرتے ہیں، زمینوں کو جوتتے اور کاشت کرتے ہیں یا تجارتی کاروبار انجام دیتے ہیں، ان سب کی حیثیت اسٹیٹ کے تنخواہ دار ملازمین کی ہوتی ہے جنھیں ان کی قابلیت، ضروریات اور کارگزاری کے لحاظ سے اسٹیٹ مشاہرہ دیتی ہے۔ اس نظام کے تحت افراد میں باہمی مسابقت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے مقررہ مشاہرہ سے زیادہ آمدنی یا نفع نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ البتہ اشتراکی نظام میں مسابقت کی اسپرٹ اس طرح قائم رہتی ہے کہ ایک ہی کارخانہ، دفتر یا بنک کے ملازمین اپنی کارگزاری، لیاقت اور محنت سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اس قسم کی مسابقت کو اشتراکی حکومت نہ صرف جائز قرار دیتی ہے بلکہ ایجاباً اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کی قابلیت اور کارگزاری ان کے کام کے دوران میں ثابت ہو جاتی ہے انھیں اسٹیٹ کی طرف سے بڑے صلے، انعامات اور اعزازات دیے جاتے ہیں اور اس طرح انھیں ترغیب دلائی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے سوسائٹی اور حکومت کو فائدہ پہنچائیں۔ عام مزدوروں کو بھی ان کی کارگزاری اور محنت کے صلہ میں اشتراکی

حکومت مخصوص مراعات عطا کرتی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اشتراکی نظام میں کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی آمدنی سے ذاتی جائداد یا ملکیت پیدا کرے یا کوئی کارخانہ قائم کرے۔

منصوبہ بندی کے اصول کے معنے یہ ہیں کہ مختلف اشیا اور مصنوعات کی پیداوار میں عام باشندوں کی ضروریات کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے وہ اسی مقدار میں تیار کی جاتی ہے۔ محنت اور سرمایہ کا باقی تمام حصہ دیگر اشیا کی تیاری پر صرف کیا جاتا ہے۔ یہ کام ایک منصوبہ بندی کی مجلس سر انجام دیتی ہے جو پہلے ملک کی عام ضروریات کا جائزہ لیتی ہے پھر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ موجود الوقت وسائل پیداوار، محنت اور سرمایہ کو کس طرح تقسیم اور منظم کیا جائے کہ ان ضروریات کی خاطر خواہ تکمیل کی جا سکے۔ نیز اس مجلس کو یہ بھی تصفیہ کرنا پڑتا ہے کہ محنت، وسائل پیداوار اور سرمایہ کا کتنا حصہ اشیائے صرف کی اور کتنا حصہ نئی مشینوں کی تیاری پر لگایا جائے۔ بالفاظ دیگر اس مجلس کو اشیائے صرف اور آلات پیدائش کے درمیان صحیح تناسب قائم کرنا پڑتا ہے اس کے بعد منصوبہ بندی کرنے والی مجلس کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ افراد ملک کو ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے مشاہروں اور دوسری شکلوں میں اجتماعی آمدنی کا کتنا حصہ تقسیم کیا جائے تاکہ اشیائے صرف کی معینہ مقدار مقررہ قیمتوں پر ساری کی ساری فروخت ہو جائے۔ مزید برآں

منصوبہ بندی کرنے والوں کو اس امر کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ آمدنی جو مشاہروں اور دیگر طریقوں سے افراد کے ہاتھ میں آنے والی ہے اس کو وہ اشیائے صرف کی خریداری کے کام میں لائیں اور اسے نہ تو بیکار جمع رکھیں اور نہ غیر ضروری کاموں پر صرف کریں۔ اس کے علاوہ مجلس منصوبہ بندی اس امر کی نگرانی کرتی ہے کہ آلاتِ پیدائش یعنی نئی مشینوں کی تیاری کے لیے جو سرمایہ اور محنت مختص کی جائے اس کا استعمال بھی صحیح طور سے ہو۔ یعنی اس کی ذخیرہ اندوزی نہ ہونے پائے۔ منصوبہ بندی کا ایک اقتضا یہ بھی ہے کہ وسائل پیدائش میں اضافہ کے ساتھ افراد کو اضافہ، تنخواہ اور دیگر شکلوں میں مزید آمدنیاں تقسیم کی جائیں تاکہ ان کی قوتِ خرید میں اسی تناسب سے اضافہ ہو جس نسبت سے پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ورنہ زائد پیداوار قوتِ خرید کی کمی کی وجہ سے بیکار ہو جائے گی کیونکہ اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ منصوبہ بندی کا کام مؤثر طریقہ سے صرف ایک اشتراکی اسٹیٹ ہی میں ممکن ہے جہاں معاشی زندگی کے ہر شعبہ پر اسٹیٹ کا مکمل قبضہ ہو اور اس کو قیمتوں کے تعین، قوتِ خریداری میں کمی بیشی اور اجتماعی آمدنی کی تقسیم کا کامل اختیار ہو۔

اشتراکی نظام کے ان دو بنیادی اصولوں یعنی اجتماعی ملکیت اور منصوبہ بندی کے فوائد آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ منصوبہ بندی کی وجہ سے اس نظام

میں کثرتِ پیداوار (OVER-PRODUCTION) کا مسئلہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ قیمتوں میں غیر معمولی اتار اور چڑھاؤ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرز کے نظامِ معیشت میں ہر شے اسی مقدار میں تیار کی جاتی ہے۔ جس قدر اس کی ضرورت ہوتی ہے اور قیمتوں کے تعین میں بھی اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ رسد اور طلب کے درمیان توازن قائم رہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں قیمتوں کا تعین ارادی طور پر عمل میں نہیں آتا بلکہ رسد اور طلب کے باہمی ردِّ عمل سے خود بخود ان کا تعین ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے اشتراکی نظام میں جہاں سمجھ بوجھ کر رسد کے تناسب سے قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں تجارتی چکر نہیں پیدا ہوتا ہے اور نہ سٹہ بازی یا تخمین (SPECULATION) کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ پھر ذرائع پیدائش کو اجتماعی ملکیت قرار دینے کے باعث ذخیرہ اندوزی اور نفع پرستی کا بھی سدباب کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس نظام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں وسیع پیمانہ پر افلاس، فاقہ کشی اور بے روزگاری کا وجود ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اشتراکی اسٹیٹ ہر شخص کی کفالت کی ذمہ داری لیتی ہے اور اس کی معمولی ضروریات کے مطابق اسے آمدنی مہیا کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کام سے جی نہ چرائے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اشتراکی نظام میں اور کوئی نقص یا خرابی نہیں واقع ہو سکتی ہے۔ اگر اس وقت تک روسی معاشرہ میں ایسی خرابیاں ظاہر نہیں ہوئی ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ

اشتراکیت ابھی اپنے عروج اور طاقت کے دور سے گزر رہی ہے اور اس کے پیروؤں کو سرمایہ دارانہ نظام سے شدید خطرہ لاحق ہے جس کی وجہ سے ان میں اپنے اجتماعی وجود اور اپنے نظام کو باقی رکھنے کا قوی جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ جذبہ ابھی اتنا طاقتور ہے کہ اس کے آگے راحت پسندی، لذت طلبی، عیش پروری یا خود غرضانہ مفاد پرستی کے جذبات دب گئے ہیں۔ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ موجودہ حالت ہمیشہ قائم رہے گی اور اشتراکی نظام کے ماننے والوں میں اس قسم کی خرابیاں کبھی نہ پرورش پاسکیں گی جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نظام میں خرابیاں کس راہ سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس نے تجارتی کاروبار اور صنعتی جدوجہد کو دفتری نظام کے سپرد کر دیا ہے۔ اس لیے کچھ زمانہ کے بعد اس میں دفتری نظام کی ساری خرابیاں پیدا ہوجائیں گی۔ دفتریت کی ایک خرابی یہ ہے کہ اس میں نااہل لوگ ذاتی تعلقات، سعی و سفارش اور خوشامد درآمد کے ذریعہ اہل تر افراد پر سبقت لے جاسکتے ہیں۔ اس لیے اس خرابی کا امکان اشتراکی نظام میں بھی موجود ہے۔ سرمایہ دار کو اپنے صنعتی اور تجارتی کاروبار سے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر نالائق ملازمین کی وجہ سے

اس کے صنعتی کاروبار میں کارگردگی کا معیار گھٹ جائے تو اسے شخصی طور سے اس عدم کارکردگی کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ آدمی شخصی نفع اور نقصان کے جذبہ سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے سرمایہ دار کارگزار اور لائق اشخاص کی قدردانی پر مجبور ہوتا ہے۔ اگر وہ محض ذاتی تعلقات یا خوشامد درآمد کے باعث نالائق اور نااہل افراد کو ترقیاں دے تو لازماً اس کا کاروبار سست پڑ جائے۔ اشتراکی نظام میں یہ شخصی عنصر مفقود ہے۔ اس کے تجارتی کاروبار اور صنعتی سرگرمیوں کا فائدہ براہ راست ان اشخاص کو نہیں پہنچتا ہے جو اس میں مشغول ہوں، اور ایسے انسانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے جو شخصی فوائد کے مقابلہ میں اجتماعی فوائد کو ترجیح دیں۔ ہم اس دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ انسانی فطرت کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کیا جاسکتا ہے یا انسانی زندگی میں سے شخصی عنصر کی طاقت کو خارج کیا جاسکتا ہے۔ خاص خاص حالات میں اور طاقتور تحریکات کے اثر سے ایک مختصر دَور کے لیے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو اتنا بے غرض بنایا جاسکتا ہے کہ وہ معاشرہ کے اجتماعی مفادات کو اپنے شخصی مفاد کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھے لیکن معمولی حالات میں افرادِ انسانی کی بیشتر تعداد اس ذہنیت سے محروم رہتی ہے اور ہمارے خیال میں اشتراکیت کے تحت بھی رہے گی۔

اس لیے یہ یقین کرنے کی معقول وجہ ہے کہ جب اشتراکیت کا موجودہ دور ختم ہو جائے گا اور وہ ان خطرات سے محفوظ ہو جائے گی جو سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کے باعث اس کے وجود کو لاحق ہیں تو اس میں دفتریت کی تمام خرابیاں ظہور کریں گی۔ صنعتوں، کارخانوں، بنکوں اور اجتماعی کاشت کے تمام اداروں میں بااثر اشخاص سے تعلق رکھنے والے ملازمین اور کارکن اور خوشامدی افراد اپنے ہم پیشہ اشخاص سے جو ممکن ہے کہ ان سے اہل تر، زیادہ کارگزار اور تجربہ کار ہوں، ترقیوں، عہدوں اور مناصب و اعزازات میں بازی لے جائیں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ صنعت و حرفت اور زراعت کی کارکردگی کا معیار گرنے لگے گا اور جس طرح سرمایہ داری کا نظام کثرتِ پیداوار کی لعنت کا شکار ہو رہا ہے اسی طرح اشتراکی نظام قلت پیداوار کے باعث ترقی اور عروج کے دَور سے پستی اور بربادی کی طرف حرکت کرنے لگے گا۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے سیاسی مقاصد

یہاں تک ہم نے سرمایہ دارانہ نظم معیشت اور اشتراکیت کے خالص پہلو سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان دونوں نظامات میں معاشی خرابیوں کے کیا امکانات ہیں۔ اب ہمیں ان معاشی نظامات کے سیاسی نتائج پر ایک نظر ڈالنی چاہیے کیونکہ ہر معاشی نظام سے اس سوسائٹی اور ملک کی ہیئت سیاسی اور طریق حکومت کا متاثر ہونا ضروری ہے جس میں وہ پیدا ہوتا اور نشوونما پاتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات کسی ملک کی سیاسی الجھنیں اور حکومتی نقائص اس کے معاشی نظام کی خرابیوں سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ اس لیے مسئلہ کا یہ پہلو بھی محتاج توجہ ہے۔

نظام سرمایہ داری کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کے تحت حکومت کے کاروبار کی سربراہی اور اس کی پالیسی کی تشکیل میں دولت مند اور سرمایہ دار طبقوں کا اثر غالب رہتا ہے۔ یہ طبقے اپنے روپیہ پیسہ کے زور سے نہ صرف بڑے بڑے اخبارات کے مالک ہو جاتے ہیں اور اس طرح رائے عامہ کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ہموار کر لیتے ہیں بلکہ انتخابات

کے وقت بھی اپنی دولت کا بے جا استعمال کر کے عوام الناس کی آرا خرید لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے حق رائے دہی کے استعمال میں آزاد نہیں رہتے ہیں اور مجبور ہو کر ایسے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں جو سرمایہ داروں کے ہمنوا اور ان کے اغراض کے آلہ کار ہوں۔ پھر اگر حکومت کوئی ایسا عملی اقدام کرنا چاہتی ہے جس کی وجہ سے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے دولت مندوں کو کوئی مالی قربانی کرنی پڑے تو سرمایہ دار طبقہ اپنے پورے اثر و رسوخ کے ساتھ حکومت کی اس پالیسی کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کوشش میں اسے ناکامی ہوتی ہے تو قوانینِ حکومت کے عملی نفاذ میں اتنی دشواریاں پیدا کرتا ہے کہ اس کی پالیسی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی اور نفع پرستی کے خلاف جہاں کہیں حکومت نے قوانین وضع کیے، ان کا نتیجہ عملاً صفر رہا۔ کیونکہ سرمایہ داروں نے نہ صرف اپنی حکومتوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا بلکہ ان کے قوانین کا اثر زائل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز تدبیر اختیار کی۔ یہی صورت بنکنگ میں پیش آتی ہے۔ صنعت و حرفت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جب کبھی کارخانہ داروں اور اہل صنعت کو سرمایہ کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے تو بجائے اس کے کہ بینک انھیں آسان شرح سود پر قرضہ فراہم کریں بالعموم وہ قرضوں پر شرح سود

بڑھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اہل صنعت کو سرمایہ حاصل کرنا اور قرض لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح سرمایہ کی جو شدید قلت پیدا ہو جاتی ہے اُسے رفع کرنے کے لیے حکومت کوئی مؤثر تدبیر نہیں اختیار کر سکتی ہے۔ ان تمام خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری میں افراد کو ذاتی ملکیت کا لامحدود حق حاصل ہے اور اس بنیادی حق کو متاثر کیے بغیر معاشی سود و بہبود کی کوئی اسکیم کارگر نہیں ہو سکتی ہے۔ جہاں وسائل دولت اور ذرائع پیدائش پر سرمایہ داروں کا مکمل قبضہ ہوگا تجارت اور صنعت و حرفت بالکلیہ ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور بنکوں کے نظام پر بھی وہی چھائے ہوں گے وہاں یہ ناممکن ہے کہ انفرادی آزادی اور ذاتی ملکیت کے حق کی تحدید کے بغیر کوئی ایسا اقدام عمل میں آئے جس سے سرمایہ دار طبقات کی غالب طاقت کے مقابلہ میں عوام کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔

اس کے برعکس اشتراکی نظام میں حکومت کو عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرمایہ داروں کی منظم طاقت کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ اشتراکی اسٹیٹ کے ہاتھ میں ملک کے جملہ وسائل معیشت، تجارت، صنعت و حرفت اور بینکنگ کا پورا انتظام ہوتا ہے اور ان امور میں افراد کا کوئی ذاتی حق تسلیم نہیں کیا جاتا ہے اس لیے وہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ ملک کی معاشی منصوبہ بندی اس طور سے کر سکتی ہے کہ

ہر فرد کی جائز حاجات وضروریات تکمیل پا سکیں۔ لیکن اس نظام میں خرابی کا ایک بہت بڑا عنصر پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ افراد کی شخصی آزادی اور جمہوری حقوق اس میں نہایت آسانی سے پامال کیے جا سکتے ہیں۔ اگر معاشی خوشحالی قومی جدوجہد کا واحد مقصود اور مطمح نظر نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کی کچھ اور اقدار بھی لائق احترام ہیں۔ اگر اختلاف رائے کی آزادی۔ اجتماع و تنظیم کی آزادی، صحافت کی آزادی اور سب سے بڑھ کر انسان کی انفرادی شخصیت کے ارتقا کی آزادی بھی اپنی اپنی جگہ حقیقی اور ضروری ہیں تو ان آزادیوں کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے اشتراکی نظام مفید نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں افراد کی یہ ضروری آزادیاں نہایت آسانی سے سلب کی جا سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشتراکی اسٹیٹ میں سرمایہ اور وسائل پیدائش یکجا ہو جانے سے ایک ادارہ (یعنی اسٹیٹ) اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ جو لوگ بھی اس پر قابض ہوں انھیں کسی حریف قوت کے خطرہ یا مقابلہ کا اندیشہ نہیں رہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اپنی تمام خرابیوں کے باوجود اس لحاظ سے انسانی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے کہ اس کے دور میں انسان کی سیاسی، مذہبی اور عقلی آزادی کا پورا پورا احترام کیا گیا۔ سرمایہ دار حکومتوں نے نہ صرف انسان کو یہ آزادی عطا کی کہ باضابطہ عدالتی کاروائی کے بغیر کسی شخص

کو قید و بند میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ انھوں نے افراد کو صحافت کی آزادی، حق رائے دہی کی آزادی اور تحریر و تقریر کی پوری پوری آزادی سے بہرہ ور کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت وقت کی مخالف جماعتیں بھی آئینی حدود میں پوری آزادی کے ساتھ کام کر سکتی ہیں اور انھیں بلا کسی معقول وجہ اور بغیر کسی آئینی طریقِ کار کے پابند یا مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور میں بھی جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کو کمیونزم کے باعث اپنے وجود کی طرف سے ایک شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اس نے کمیونسٹ پارٹیوں کو ہر جگہ ممنوع نہیں قرار دیا ہے بلکہ موجودہ نازک صورتِ حال کے باوجود اکثر ممالک میں ان کی آزادی بڑی حد تک محفوظ ہے۔ یہ چیز اشتراکی نظام میں غیر ممکن اور ناپید ہے۔ کیونکہ اس نظام کے تحت کسی مخالف جماعت کے وجود کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا اشتراکی نظام کے تحت انسان کے جمہوری حقوق اور اس کی تمدنی اور معاشرتی آزادیاں باقی رہ سکتی ہیں جن کا وجود ارتقائے ذات اور ارتقائے شخصیت کے لیے لازمی اور لابدی ہے۔ جمہوری نظام میں لاکھ خرابیاں ہوں لیکن اس کے بعض اصول انسان کے عقلی اور روحانی ارتقا کے لیے بمنزلہ اساس اور بنیاد کار کے ہیں۔ مثلاً وہ معاشی پہلو سے قطع نظر جملہ افرادِ معاشرہ کو عدل و

انصاف اور قانون کی نگاہ میں مساوات کی ضمانت دیتا ہے۔ اس میں قانون اور عدالت کے توسط کے بغیر کسی شخص کو سزائے قید یا سزائے قتل نہیں دی جاسکتی ہے۔ کسی پارٹی یا کسی اقلیت کے خلاف امتیازی قوانین وضع نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ اور کسی شخص کو حکومت اس کے ضمیر اور ایمان کے خلاف عمل کرنے پر قانوناً مجبور نہیں کرسکتی ہے۔ اس معیار سے جانچیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام میں بھی ان اصولوں پر پوری طرح عمل نہیں کیا گیا لیکن اس نے بڑی حد تک ان کو برتنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام سرے سے ان اصولوں کو تسلیم ہی نہیں کرتا ہے۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش تو اور بات ہے۔ ایک اور سبب بھی ہے جس کے باعث اشتراکی نظام میں یہ آزادیاں قائم نہیں رہ سکتی ہیں۔ اشتراکیت کے نظام میں ہر فرد کی حیثیت ایک سرکاری ماہوار یاب ملازم کی ہوتی ہے خواہ اس کا پیشہ یا خدمت کچھ بھی ہو۔ مثلاً کارخانوں کے ملازمین، مزدوروں، منیجروں، ماہرین فن اور منتظمین کو اس نظام کے تحت وہ آزادیاں نصیب نہیں ہوسکتی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام میں انھیں حاصل ہیں۔ ایک سرمایہ دار کو اپنے کارخانہ کے مزدوروں اور ملازمین کے سیاسی رویہ سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے۔ اگر اس کا کوئی لائق اور کارگزار ملازم کسی ایسی سیاسی جدوجہد میں حصہ لے جس کا براہِ راست تصادم سرمایہ داروں کے مفاد

سے ہو تب بھی سرمایہ دار اس کی کارگزاری اور لیاقت کی وجہ سے اسے بآسانی برطرف نہیں کر سکتا ہے بلکہ اکثر اوقات اسے ملازم رکھنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ اسے سیاسی اُمور سے زیادہ اپنے کارخانہ کی کارکردگی اور اپنے ذاتی نفع سے دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن اشتراکی نظام میں کسی مزدور، ملازم، منیجر یا ماہر فن کو اپنے آجر یعنی اسٹیٹ سے اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکتی ہے، نہ وہ کسی ایسی سیاسی جدوجہد میں حصہ لے سکتا ہے جو اسٹیٹ کی پالیسی سے اختلاف پر مبنی ہو۔ اس لیے جس طرح آج کل کی حکومتوں میں سرکاری ملازمین سیاسی آزادی سے محروم اور چاروناچار حکومت کی پالیسی کے نفاذ پر مجبور ہوتے ہیں خواہ یہ پالیسی ان کی رائے میں اجتماعی مفاد کے منافی ہو۔ اسی طرح اشتراکی نظام میں جملہ افرادِ معاشرہ کی یہی حالت ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہر فرد کا رزق اور وسیلہ معاش حکومت کے قبضہ میں ہوتا ہے۔

پھر اشتراکی نظام میں انسان کی عقلی آزادی بھی اسی درجہ متاثر ہوتی ہے، جتنی اس کی سیاسی آزادی کیونکہ اس میں معاشرت و تمدن اور علوم و فنون کے دائرہ میں سارے نظریات و خیالات کی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور کسی ایسے خیال و رائے کے اظہار کی آزادی نہیں دی جاتی ہے جو کمیونسٹ نظریۂ حیات کے منافی ہو۔ یہاں تک کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں نئی تحقیقات کی بنا پر جو نظریے قائم کیے جاتے ہیں ان کو بھی اس

نقطۂ نظر سے جانچا جاتا ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفہ مادیت کے خلاف تو نہیں ہیں۔ اشتراکی حکومت کا احتساب صرف سیاسی اور معاشی شعبہ جات حیات تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے جملہ مشاغل تک وسیع ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے نظام میں یہ ناممکن ہے کہ انسان کی عقلی آزادی قائم رہ سکے یا اس کی حریت ضمیر و فکر متاثر نہ ہو۔ اشتراکیت کا فطری رجحان آمرانہ نظام زندگی کی طرف ہے۔ اس لیے اس میں جمہوری اصولوں کی نشوونما کا کوئی امکان نہیں ہے۔ چنانچہ اب تک جہاں کہیں اشتراکی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان کا طرز آمرانہ ہے اور ان کی ظاہری اور معنوی ترکیب میں کلیت پسندی کے اصول داخل ہیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کی خوبیوں اور برائیوں کے بارے میں جو تصریحات کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کو ان دونوں نظامات سے کلی مغائرت ہے۔ اسلام اس امر کو گوارا نہیں کرتا ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد فاقہ کشی، تنگدستی اور بے روزگاری میں مبتلا ہو اور حکومت یا سوسائٹی اس کی امداد و اعانت کا کوئی انتظام نہ کرے۔ اس لیے وہ معاشی امور میں ہر شخص کو بقدر ضرورت معاش دلانے کا بندوبست کرتا ہے اور معذوروں، بیواؤں، یتیموں اور ناکارہ افراد کے معاشی حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اسلام اور سرمایہ داری میں زمین و آسمان

کا فرق ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کے بھی خلاف ہے کہ تمام انسانوں کو ایک بڑی مشین کا پرزہ بنا دیا جائے اور ان کی انفرادیت کے نشوو ارتقا کی تمام راہیں بند کر دی جائیں۔ یا ان کی سیاسی عقلی اور مذہبی آزادی پر ایسی دست درازی کی جائے کہ وہ معاشی خوشحالی کی خاطر اپنی انفرادیت سے دست بردار ہونے کو ترجیح دیں۔ اسلام میں اشتراکیت کے بعض عمدہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ سٹہ بازی، نفع اندوزی اور سودی لین دین کو ممنوع قرار دیتا ہے اور سرمایہ یا زمین پر افراد کو لامحدود حق ملکیت نہیں دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ افراد کی جائز معاشی، سیاسی، مذہبی اور عقلی آزادی کو بھی سلب کرنا نہیں چاہتا ہے اور اسٹیٹ کو اتنا طاقت ور نہیں بناتا ہے کہ افراد اس کے سامنے بالکل بے زور اور بے زبان ہو جائیں۔ ان وجوہ سے اسلام کو نہ تو سرمایہ داری کا مترادف قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اشتراکی نظام کا مثنیٰ۔ لیکن چونکہ اسلامی نظام ایک ایسے دور میں ظہور پذیر ہو گیا تھا جس کے حالات ہمارے موجودہ حالات سے بہت مختلف تھے اس لیے اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ حالات کی تبدیلی اور زمانہ کے اختلاف سے جو فرق واقع ہو گیا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے اس زمانہ میں اسلام کے معاشی اصولوں کا کس طرح اطلاق کیا جائے گا۔ آیا جدید اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری کے قریب تر ہو گا یا اشتراکیت کے، اس مسئلہ پر ہم آئندہ

صفحات میں تفصیلی بحث کریں گے اور اسلامی نظام کا ایک مفصل خاکہ پیش کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے معاشی حالات کا تجزیہ کرکے معلوم کریں کہ اس زمانہ کے معاشی مسائل کیا تھے اور اسلام نے انھیں کس طریقہ سے حل کیا۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنے زمانہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے آیا موجودہ حالات میں بھی وہی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں یا ان میں ترمیم و تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ اگر اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو اس ترمیم و تجدید کے اصول کیا ہوں گے۔ آیا ان اصولوں کا کوئی سراغ ہمیں اسلامی تعلیمات میں ملتا ہے یا ہم آزاد ہیں کہ اپنی خواہشات کے مطابق جس طرح چاہیں معاشی مسائل کو حل کریں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اسلام نے ہر شعبہ حیات میں ہماری رہنمائی کی ہے اور آئندہ کے لیے چند اصول بتا دیے ہیں جن کی پابندی بحیثیت مسلمان ہمارے اوپر فرض ہے۔ اس لیے معاشی دائرہ میں بھی ہمیں اسلام ہی کے وضع کردہ اصولوں کو اپنا رہنما قرار دینا چاہیے۔ اس حد تک اسلام نے ہماری آزادی محدود کر دی ہے۔ لیکن بحث طلب امر یہ ہے کہ آیا اسلام کے وضع کردہ اصولوں اور ان مخصوص طریقوں میں کوئی فرق ملحوظ کیا جا سکتا ہے جن کے ذریعہ سے اس نے ایک خاص عہد میں اپنے معاشی

مسائل حل کیے تھے۔ یا اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں اور ان طریقوں میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا ہے۔ اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہم پہلے اسلامی عہد کے معاشی حالات اور مسائل کی نوعیت واضح کریں گے اور پھر یہ معلوم کریں گے کہ اس دور میں ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو معاشی نظام وضع کیا گیا تھا اس کے مطالعہ سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر کیا روشنی پڑتی ہے جن کے مطابق موجودہ زمانہ میں ہماری سوسائٹی کی معاشی تعمیر کی جاسکتی ہے۔

اسلامی عہد کے معاشی حالات

اسلام جس سوسائٹی میں پیدا ہوا اس میں زرعی یا صنعتی مسائل کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کیونکہ عرب کے ملک میں قابلِ کاشت زمین کا رقبہ بہت محدود ہے۔ دیگر ممالک مثلاً ایران اور روم کے برعکس ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں بڑی بڑی جاگیروں اور زمینداریوں کا وجود نہ تھا کیونکہ پیدائش دولت کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے ان کی معیشت میں زمین کو بہت کم اہمیت حاصل تھی۔ بلکہ عرب بالعموم اور خاص طور پر قریش زراعت اور کاشتکاری کو ایک نہایت ذلیل پیشہ سمجھتے تھے۔ بجز یمن کے جہاں زمین کی کاشت وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی اور اس مقصد کے لیے بڑے بڑے بند تعمیر کیے گئے تھے تاکہ بارش کے پانی کو کھیتی باڑی کے لیے جمع رکھا جا سکے۔ شمالی عرب اور وسط عرب میں زراعت برائے نام تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عربوں کی غذائی ضروریات کے لیے غلہ شام سے آتا تھا اور لوگ غلّہ کے بیوپاریوں کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ سورہ جمعہ میں جہاں قرآنِ حکیم نے تجارت اور خرید و فروخت کے مقابلہ میں ذکرِ الٰہی کی ترجیح بیان کی ہے اس کی شانِ نزول یہ

تھی کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ غلہ کے بیوپاریوں کی آمد کا غل ہوا اور بہت سے نمازی نماز چھوڑ کر مسجد سے نکل گئے۔ اصل میں عربوں کی آبادی دو بڑی قسموں پر مشتمل تھی۔ ایک بدوی عرب جو لوٹ مار اور گلہ بانی پر زندگی بسر کرتے تھے اور خانہ بدوشی کے عالم میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتے تھے۔ دوسرے حضری عرب جو کہ مکہ، مدینہ، طائف اور شمالی عرب کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں مستقل سکونت رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر افراد تجارت پیشہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل مکہ تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں روم اور ایران کے تجارتی نمائندے مقیم رہتے تھے اور عرب تاجروں سے لین دین کیا کرتے تھے۔ مکہ میں قریش کا قبیلہ تجارت کے لیے خاص طور سے ممتاز تھا۔ ان کے تجارتی قافلے مدینہ کے راستے شام کو آیا جایا کرتے تھے۔ شام سے عربوں کے تجارتی تعلقات کتنے گہرے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں بصریٰ تشریف لے گئے تھے۔ عربوں کی اس تجارتی سرگرمی کی وجہ یہ تھی کہ وسط ایشیا سے براہِ ایران روم تک تجارت کا سلسلہ قائم تھا جس کا راستہ شمالی عرب سے گزرتا تھا۔ شمہ ا... ،،اس وسیع تجارتی کاروبار میں پوری طرح حصہ دار تھے۔ وسط

ایشیا سے جو تجارتی سامان براہِ ایران شام و روم جاتا تھا اس کی ترسیل اور حفاظت کی ذمہ داری بھی عربوں کے سر تھی۔ خود عربوں کے ملک میں ایسی پیداوار بہت کم تھی جس کی تجارت اور لین دین وہ دوسرے ممالک سے کر سکتے۔ پھر بھی عود، بخورات اور لوبان وغیرہ عرب میں بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ یمن میں قہوہ بھی کثرت سے ہوتا تھا نیز چمڑے کی کھالیں عرب کی خاص پیداوار تھیں جس کی وجہ سے ملک میں دباغت کا پیشہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ طائف اس زمانہ میں دباغت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ چنانچہ لوگ اس شہر کو بلدۃ الدباغ کہتے تھے۔ جنوبی عرب کی ریاستیں سبا اور حمیر اپنی تجارتی سرگرمی کی وجہ سے بہت شہور تھیں۔ ان کے تجارتی قافلے شمالی عرب سے ہو کر گزرتے تھے، اسی وجہ سے شمال میں جا بجا ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔ شمالی عرب کے باشندوں کو تجارت میں ترقی کا موقع اسی وقت ملا جب عرب کی جنوبی ریاستیں تباہ ہو گئیں۔ اس طرح حضری عرب ایک قلیل پیمانہ پر زراعت کے ذریعہ اور نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت کے ذریعہ اپنی معاش پیدا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں جہاں زمین کی کاشت اتنے محدود پیمانہ پر ہوتی تھی زمینداری یا جاگیرداری کے مسائل نہیں پیدا ہو سکتے تھے۔

ظہورِ اسلام کے بعد پہلے قریش اور مسلمانوں کی جنگوں کا سلسلہ قائم رہا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انتقال فرمایا اور سارے عرب میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ ابھی یہ خانہ جنگی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایران اور روم سے جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس طرح ابتدائے اسلام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات تک مسلمان برابر جنگ میں مصروف رہے اور انھیں ملک کے معاشی استحکام اور اقتصادی اصلاحات کی طرف توجہ کرنے کا بہت کم موقع ملا۔ ایسے حالات میں اسلام عربوں کی زندگی میں کوئی بڑا معاشی انقلاب پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ اول تو عربوں کے ذرائع معیشت بہت محدود تھے، اور ملک میں زمینداری یا جاگیرداری کے مسائل ناپید تھے۔ دوسرے اسلام کی ساری توجہ تبلیغ اور جہاد پر مرتکز رہی جس سے مسلمانوں اور اسلام کی بقا وابستہ تھی۔

عہدِ رسالت کے ذرائع آمدنی اور تقسیمِ دولت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شمالی عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور نہ اجتماعی آمدنی کے حصول اور تقسیم کا کوئی منظم طریقہ تھا۔ اسلام میں پہلی مرتبہ آمدنی کی تقسیم کا سوال اس وقت پیدا ہوا جب غزوۂ بدر کے بعد مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

واعلموا انّما غنمتم من شی ءفان للّٰہ خمسہٗ وللرسول و لذی القربٰی والیتمٰی والمسٰکین وابن السبیل۔ (الانفال: ۴۱)

جان لو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تمھیں حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسولؐ کے لیے اور اس کے قریبی رشتہ داروں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

اسلام کا یہ پہلا معاشی حکم تھا جس سے اس نے اپنے طریقِ عدل کا اظہار کیا۔ چنانچہ مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے معاشرہ کے کمزور اور نادار افراد کو ایک حصہ دیا گیا۔ حالانکہ یہ ذریعۂ آمدنی یعنی مالِ غنیمت درحقیقت

اسلامی حکومت کی آمدنی نہ تھی بلکہ مجاہدین کی ذاتی سرفروشی اور قربانی کا نتیجہ تھی۔ پھر دوسرا معاشی سوال اس وقت پیدا ہوا جب مدینہ کے یہودی قبائل بنو نضیر اور بنو قریظہ پر مسلمانوں نے فتح پائی اور ان کی زمینوں کی تقسیم عمل میں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان زمینوں کو مہاجرین اور دو غریب انصاریوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ پھر جب خیبر کے یہودیوں پر مسلمانوں نے فتح پائی تو حضور رسالت مآبؐ نے ان مفتوحہ اراضی کو بھی مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا۔ لیکن ان دونوں مقامات یعنی مدینہ اور خیبر میں زمین کی تقسیم جن حالات میں کی گئی تھی ان کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ زمانہ اسلام کا بالکل ابتدائی عہد تھا جبکہ اس کی آمدنی نہایت قلیل اور وسائل بہت محدود تھے۔ مجاہدین کی ایک مستقل فوج اسلام کے لیے ہر وقت سینہ سپر رہتی تھی۔ ان فوجیوں کو کوئی مشاہرہ یا معاوضہ باقاعدہ طور سے حکومت کی طرف سے نہیں ملتا تھا اور نہ مل سکتا تھا۔ اس لیے اس وقت ان کی خدمات کا صلہ صرف اسی صورت میں انھیں دیا جا سکتا تھا کہ مفتوحہ زمینیں انہی کے درمیان تقسیم کر دی جائیں۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے موجودہ نظامِ زمینداری یا جاگیرداری کا جواز ثابت کرنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حکومت کی اتنی آمدنی ہوتی کہ وہ فوجیوں اور مجاہدین کو باقاعدہ تنخواہیں دے سکتے تو بہت ممکن ہے کہ

آپؐ مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہ فرماتے بلکہ جیساکہ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، انہی تمام مسلمانوں کی املاک قرار دیتے۔ اس کے علاوہ یہ زمینیں جو بطور جاگیر مسلمانوں کو دی گئیں تھیں رقبہ میں اس قدر محدود تھیں کہ انھیں موجودہ مفہوم میں جاگیر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمینداریوں اور جاگیروں کا رقبہ اور ان کی نوعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ جاگیروں سے بہت مختلف تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی مشترک علّت نہیں پائی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فتوحات کا دائرہ جب وسیع ہوا اور آپؐ کے قبضہ میں ایسی زمینیں آئیں جن پر غیر مسلم کاشت کرتے تھے تو آپ نے ان پر خراج یعنی محصول اراضی عائد کیا۔ خراج اسلام کا کوئی جدید محصول نہ تھا بلکہ ایران اور روم کے طریق محصول بندی سے ماخوذ تھا۔ چنانچہ ایران میں اس کو خراگ کہتے تھے اور روم میں (TRIBUTUM SOLI)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانہ کی متمدن سلطنتوں کے سیاسی اور معاشی طریقے اختیار کرنے کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ یہ طریقے مزاجِ اسلام اور دین کے بنیادی اصولوں کے مغائر نہ ہوں۔ خراج کی آمدنی فوجی مہمات کی تیاری پر صرف کی جاتی تھی کیونکہ اس زمانہ میں اسلامی مملکت کا سب سے بڑا خرچ یہی تھا۔ مسلمانوں سے زمین کی پیداوار پر خراج کی جگہ عشر

وصول کیا جاتا تھا اور اُسے عام محصول کی جگہ زکوٰۃ کی ایک مد قرار دیا گیا تھا۔ لیکن عشر اور زکوٰۃ میں فرق یہ تھا کہ عشر سال بھر کے بعد نہیں بلکہ فصل کے ختم ہونے پر وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عشر کی صورت میں یہ استثنا نہ تھا کہ صرف بالغوں اور صحیح الحواس اشخاص سے عشر لیا جائے جیساکہ زکوٰۃ میں ہوتا تھا بلکہ نابالغوں اور مجنونوں کی ملکیت پر عشر وصول کیا جاسکتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد جیساکہ آگے بیان ہوگا خراج اور عشر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تفریق قائم نہیں رہی۔ بلکہ جب مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے منشا اور حکم کے خلاف غیر مسلموں سے بڑی بڑی جاگیرات اور زمینیں خریدنی شروع کیں تو اُن سے عشر کے بجائے خراج ہی وصول کیا گیا۔

غیر مسلموں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے بجائے جزیہ وصول کیا۔ یہ محصول بھی ارکانِ دین میں سے نہ تھا۔ جیساکہ اس زمانہ میں اکثر مسلمان سمجھتے ہیں بلکہ ایران اور روم کی محصول بندی کے طریقوں میں سے تھا، جسے مسلمانوں نے اپنا لیا۔ چنانچہ ایران میں اس محصول کو گزیت اور روم میں اُسے ٹریبوٹم کیپٹس (TRIBUTUM CAPITIS) کہتے تھے۔ البتہ ان سلطنتوں میں یہ محصول بلا امتیاز مذہب و ملّت ہر شخص سے لیا جاتا تھا۔ اسلام نے اسے صرف غیر مسلموں تک محدود رکھا۔ درحقیقت اس محصول

کی کوئی مذہبی یا شرعی علت نہ تھی بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اس تفریق کی محرک ایک سیاسی اور قومی مصلحت تھی۔ اور وہ یہ کہ عرب ابتدا سے کسی منظم مرکزی حکومت کے اقتدار کے تابع نہیں رہے تھے اور نہ کسی مرکزی حکومت کو محصول ادا کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے وہ محصول کے نام سے حکومت کو کچھ دینا اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے تھے اور اُسے غلامی کی علامت قرار دیتے تھے۔ چنانچہ اسلام نے اس بارے میں ان کے احساسات کی پاسداری کی اور محصول کے نام سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں سے زکوٰۃ لینی شروع کی۔ اس نظریہ کی تائید ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے جسے بلاذری نے بیان کیا ہے۔ یہ مورخ لکھتا ہے کہ بنی تغلب کے عیسائی قبیلہ سے جب جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے اس کی ادائیگی اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھی اور مسلمانوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ جزیہ کی بجائے ان سے زکوٰۃ کی دو چند رقم وصول کرلی جائے۔ مسلمانوں نے ان کی یہ تجویز منظور کرلی۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب مسلمانوں پر جزیہ نہ لگانے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ادائیگی محصول کے خلاف ایک عام قومی احساس پایا جاتا تھا بلکہ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین جزیہ کو رکنِ دین یا اسلام کا کوئی بنیادی اصول نہیں سمجھتے تھے ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اگر مسلمان جزیہ کو مذہبی اصول کی حیثیت دیتے تو وہ بنو تغلب کی یہ شرط

کبھی نہ منظور کرتے کہ ان سے جزیہ کے بجائے زکوٰۃ کی دو چند رقم لے لی جائے۔ جزیہ کی شرح میں بھی مسلمانوں نے اقتضائے حالات کے تحت تبدیلیاں کیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جزیہ کی شرح فی کس ایک دینار تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ شرح تبدیل ہوگئی۔ اگر زکوٰۃ کی طرح جزیہ کو بھی رکن دین خیال کیا جاتا تو حضرت عمرؓ اس کی شرح کبھی تبدیل نہ کرتے۔ جزیہ اور خراج کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی حکومت کو زکوٰۃ اور فے سے بھی آمدنی ہوتی تھی۔ فے ان زمینات کو کہتے تھے جو براہِ راست حکومت کی ملکیت ہوتی تھیں، مثلاً فدک وغیرہ۔

عہدِ خلافتِ راشدہ اور بنو اُمیہؓ کے معاشی حالات

حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں اسلام کے مالی نظام میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق اور شام کی فتوحات کے بعد کچھ ایسے مسائل پیش آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے معاشی اور مالی طریقوں میں تبدیلی کرنی ضروری ہو گئی۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ مفتوحہ علاقوں کی زمین کی تقسیم سے متعلق تھا۔ اس کے بعد دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان علاقوں کے کاشتکاروں کو کیا حقوق دیے جائیں اور ان سے کون کون سے محصول لیے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے زمانہ میں مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت اس عمل کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ اسلامی حکومت کی آمدنی اتنی محدود تھی کہ فوجیوں کو باقاعدہ تنخواہیں تقسیم نہیں کی جا سکتی تھیں اور ان کی خدمات کا کچھ نہ کچھ معاوضہ انھیں دیا جانا ضروری تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ صورتِ حال باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے آنحضرتؐ کے طریق کو بدلنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں محسوس کی اور جب مجاہدین نے ان

سے استدعا کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق عراق اور شام کی زمینیں ان کے درمیان تقسیم کر دی جائیں تو انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اس حکم کے جواز میں حضرت عمرؓ نے قرآنِ مجید کی ایک آیت سے استدلال فرمایا تھا لیکن درحقیقت ان کا یہ حکم ایک سیاسی مصلحت پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر زمین کی ملکیت اور جاگیرداری کا طریقہ مسلمانوں میں پھیل گیا تو ان کی مجاہدانہ اسپرٹ اور عسکری قوت بالکل فنا ہو جائے گی۔ وہ روم اور ایران کے جاگیری نظام کی خرابیوں سے پوری طرح واقف تھے اور مسلمانوں کو اس لعنت سے بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوج والوں کی باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر کر دیے اور مفتوحہ ممالک کی اراضی کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت بنا دیا۔ البتہ انھوں نے عراق اور شام کے کسانوں کے حقوقِ ملکیت کا پورا پورا تحفظ کیا۔ یعنی انھیں آزادی دی کہ وہ آپس میں اپنی زمینوں کی خرید و فروخت کریں۔ لیکن ذاتی ملکیت کا یہ حق بھی لامحدود نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ یہ شرط تھی کہ وہ اپنی زمین کو کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ اس طرح زمین کی ملکیت کی تحدید کا اصول حضرت عمرؓ کے عمل سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے زمانہ میں کوئی مسلمان خواہ عرب ہو یا غیر عرب مفتوحہ علاقوں میں ایک چپہ زمین بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ مصر میں بھی مسلمانوں کے لیے یہی ممانعت تھی۔ ایک

مسلمان نے اس حکم کے خلاف مصر میں کچھ زمین خرید لی تو حضرت عمرؓ نے اسے نہایت سخت سزا دی۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر مسلمانوں کو زمیندار یا جاگیردار نہیں بنانا چاہتے تھے اور اپنی زندگی بھر وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ رومیوں اور ایرانیوں کے نظام جاگیرداری اور زمینداری کو بالکل مٹا دیں اور مسلمانوں کو اس کے اثرات سے محفوظ کر دیں۔ اگرچہ اپنے زمانہ کے حالات و مصالح اور بعض مجبوریوں کے باعث انھیں چند صورتوں میں اس کے خلاف بھی عمل کرنا پڑا اور بعض مسلمانوں کو انھوں نے اقطاع یا جاگیریں بھی دیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں میں جاگیروں اور اراضی کے حصول کا شوق اتنا بڑھا کہ پھر کوئی خلیفہ اس بند کو محفوظ نہ رکھ سکا جسے حضرت عمر باندھ گئے تھے اور جاگیری نظام کے سیلاب نے مسلمانوں کو اسی لعنت میں مبتلا کر دیا جس سے روم اور ایران تباہ ہوئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں بیت المال کی باقاعدہ تنظیم کی۔ انھوں نے اہلِ فوج کے رجسٹر تیار کروائے جن میں قبیلہ وار ہر فوجی کا نام درج تھا پھر فوجیوں کے باقاعدہ وظیفے اور مشاہرے مقرر تھے۔ یہاں تک کہ ان کے اہل و عیال اور غلاموں کو بھی وظائف ملتے تھے۔ حضرت عمر کے زمانہ تک وظائف کی تقسیم میں عرب اور غیر عرب کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہر مسلمان

پر فوجی خدمت لازم تھی خواہ وہ عربی النسل ہو یا عجمی۔ چنانچہ نومسلموں کو بھی بیت المال سے وظائف ملتے تھے۔ مگر جب اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور مسلمانوں کی تعداد میں بکثرت اضافہ ہونے لگا اس وقت یہ طریقہ قائم نہیں رہا۔ کیونکہ اتنی کثیر آبادی کو وظائف دینے کے لیے حکومت کا خزانہ ناکافی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو اُمیہ کے دَور میں نومسلموں کے اس مطالبہ کو رد کر دیا گیا کہ انھیں حسبِ سابق دوسرے مسلمانوں کی طرح وظائف دیے جائیں۔ وظائف کے تعیّن میں حضرت عمرؓ نے اصولِ مساوات قائم نہیں رکھا بلکہ مسلمانوں کی مذہبی اور مجاہدانہ خدمات کے لحاظ سے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ جن لوگوں نے اسلام کے لیے زیادہ قربانیاں کی تھیں ان کے وظائف کی رقم بھی زیادہ ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس تفریق و امتیاز کو روا نہیں رکھا تھا۔ ان کے زمانہ میں ہر فوجی کی تنخواہ بلالحاظِ خدمات مساوی تھی۔ ایک مرتبہ جب ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ اہلِ فوج کی تنخواہوں کے تعیّن میں بلحاظِ خدمات ایک کو دوسرے پر ترجیح ملنی چاہیے تو انھوں نے فرمایا:

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذلک وانما ذٰلک شیٔ ثوابہ علی اللہ جل ثناؤہ وھٰذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ۔ (کتاب الخراج)

تم نے بعض لوگوں کی فضیلت اور خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے میں واقف ہوں لیکن اس کا ثواب اللہ کے یہاں ہے۔ مگر یہ معاش کا معاملہ ہے جس میں ترجیح کی بجائے مساوات بہتر ہے۔

حضرت عمر بھی آخری عمر میں اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اہلِ فوج کے ساتھ ترجیح کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

لئن عشت الیٰ ھٰذہ اللیلۃ من قابل لالحقن اخری الناس باولٰی ھم حتیٰ یکونوا فی العطاء سواءً۔

اگر میں کچھ اور عرصہ زندہ رہا تو میں بعد میں آنے والے اشخاص کو پہلوں سے ملا دوں گا یہاں تک کہ دونوں برابر ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ کی زرعی اصلاحات

عراق، شام اور مصر کی فتوحات کے بعد حضرت عمرؓ کے سامنے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ان ممالک کے زرعی نظام میں کیا تبدیلی کی جائے۔ ان تینوں علاقوں کے حالات اور طریقِ محصول بندی جدا تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی فتوحات کے باعث جو انقلاب واقع ہوا تھا، اس کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ عراق، شام اور مصر کے شاہی خانوادے جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی جاگیریں تھیں اور بڑے بڑے زمیندار جو حکومت کے متوسلین اور باجگزار تھے ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے یا برباد ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام زمینات جو شاہی خاندان کے افراد اور زمینداروں کے قبضہ میں تھیں یا آتش کدوں اور عیسائی کلیساؤں کے لیے وقف تھیں بے مِلک ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے ایسی تمام زمینوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور انھیں اسلامی حکومت کی ملکیت قرار دیا۔ باقی زمینیں جو متوسط درجہ کے زمینداروں، کاشتکاروں کے قبضہ میں تھیں انہی کے ہاتھوں میں رہنے دی گئیں لیکن ان کے قابضین کو خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔ سابقہ حکومت کے تحت خراج کی

وصولی اور تشخیص کے جو طریقے رائج تھے حضرت عمرؓ نے انھیں تھوڑی تبدیلی اور ترمیم کے ساتھ قائم رہنے دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے زمانہ میں ان ممالک کا زرعی نظام وہی تھا جسے ایرانیوں اور رومیوں نے جاری کیا تھا۔ لیکن ایک بڑا عظیم الشان فرق یہ پیدا ہو گیا تھا کہ جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا طبقہ مٹ گیا۔

ساسانی عہد میں خسرو نوشیرواں کے زمانہ سے زمین کا محصول یعنی خراج پیداوار کی مناسبت سے وصول کیا جاتا تھا یعنی فصل اچھی ہوتی تو خراج کی مقدار بڑھا دی جاتی تھی اور اگر کسی سال غلہ کم پیدا ہوتا تو خراج میں تخفیف کر دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بظاہر منصفانہ تھا لیکن اس میں بڑی خرابی یہ تھی کہ کاشتکاروں کو تیاریٔ فصل کے بعد خراج کے افسروں کے معائنہ تک انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ معائنہ اور تشخیص سے قبل وہ اپنی پیداوار فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس انتظار کے دوران میں تیار شدہ فصل اکثر خراب ہو جاتی تھی اور کاشتکاروں کو بڑا نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس لیے خسرو نوشیرواں نے تمام زمینات کی از سرِ نو پیمائش کرائی اور جن زمینوں پر غلہ کی کاشت ہوتی تھی ان پر بحساب ایک درہم فی جریب خراج مقرر کیا۔ دوسری زمینوں پر خراج کی مقدار مختلف تھی۔

سواد کے علاقہ میں حضرت عمر کو چار اقسام کی زمینوں پر چار مختلف

طریقوں سے خراج عائد کرنا پڑا۔ اوّلاً حیرہ اور بعض دوسرے شہر جن سے مسلمانوں نے علیحدہ علیحدہ معاہدات کیے تھے۔ دوم وہ زمینات اور جاگیرات جو دہاقین یعنی بڑے بڑے کسانوں کے قبضہ میں تھیں۔ سوم ساسانی خانوادہ شاہی اور امرا کی زمینیں جن کا کوئی مالک نہ تھا۔ چوتھے بنجر اور غیر آباد زمینیں۔ حیرہ کے بارے میں جو شہادت موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اس شہر پر ایرانیوں کا مکرر قبضہ ہوا اور مسلمانوں نے اسے ہر مرتبہ از سرِ نو فتح کیا لیکن حضرت خالدؓ کی فتح کے وقت اہلِ حیرہ سے جو معاہدہ ہوا تھا وہی قائم رکھا گیا۔ یحییٰ بن آدم کا بیان ہے کہ اہلِ حیرہ سے ایک مقررہ رقم بطور خراج وصول کی جاتی تھی اور باشندگانِ حیرہ اسے آپس میں تقسیم کر لیتے تھے لیکن اہلِ حیرہ سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اہلِ حیرہ کو تحتِ معاہدہ یہ بھی اختیار تھا کہ وہ اپنی زمینوں کی خرید و فروخت کر سکتے تھے۔ یہ حق صرف انہی آبادیوں کو حاصل ہوتا تھا جن سے مسلمان اجتماعی طور پر خراج کی ایک مقررہ رقم وصول کرتے تھے۔ دوسری قسم کی زمین جس میں بڑے بڑے گاؤں شامل تھے مقامی دہقانوں یا ایسے اشخاص کے قبضہ میں تھی جو اپنے قرب و جوار میں بڑی حیثیت والے شمار کیے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق حضرت عمرؓ کا تصور یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کی مزاحمت کی ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے ان سے کوئی معاہدہ نہیں کیا اور نہ ان زمینوں پر ان کا

حقِ ملکیت تسلیم کیا لیکن ان کے ساتھ یہ رعایت کی کہ زمینیں اس شرط کے ساتھ ان کے قبضہ میں رہنے دیں کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ اسلامی حکومت کو وہی محاصل ادا کریں جو انھیں خسرو کے عہدِ حکومت میں ادا کرنے پڑتے تھے۔ خسرو کے زمانہ میں جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں غلہ پیدا کرنے والی زمینوں پر بحساب ایک درہم فی جریب محصول لیا جاتا تھا۔ انگور کی زمینوں اور کھجور پیدا کرنے والی زمینوں پر محصول کی مقدار زیادہ تھی۔ باقی تمام زمینیں بری المحصول تھیں۔ طبری کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے انہی زمینوں کو محصول سے مستثنیٰ کیا جو ساسانیوں کے زمانہ میں مستثنیٰ تھیں۔ لیکن چند سال کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ نے انھیں اس امر کی جانب توجہ دلائی کہ غلہ کے سوا دوسری اشیا پیدا کرنے والی زمینیں محصول سے مستثنیٰ رہ گئی ہیں حالانکہ ان زمینوں کا مجموعی رقبہ بہت وسیع ہے اور ان سے کسانوں کو آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ کسانوں نے محصول سے بچنے کے لیے غلہ کے بجائے دوسری اشیا کی کاشت شروع کر دی تھی۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اس محصول کے بارے میں نئے احکام جاری فرمائے جن میں سابقہ نرخوں کی ترمیم کی گئی تھی اور دوسری زمینوں پر بھی محصول عائد کیا گیا تھا۔ تیسری اور چوتھی قسم کی زمینیں وہ تھیں جو شاہی خاندان کے افراد اور امرا کی املاک تھیں۔

یا ارض موات یعنی بنجر اور غیر آباد زمینیں۔ ان زمینوں کا اس وقت کوئی مالک نہیں رہا تھا البتہ شاہی زمینات پر کسان اب بھی کاشت کرتے تھے۔ ان زمینوں کی ملکیت حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ میں لے لی یعنی اسلامی حکومت کو ان کا مالک قرار دیا۔ اس میں وہ زمینیں بھی شامل تھیں جن کے مالک لڑائیوں میں قتل کر دیے گئے تھے یا فتوحات کے دوران میں ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یا جنھیں ساسانی بادشاہوں نے رعایا سے ضبط کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کی تقسیم اور انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ یہی اراضی صوافی کہلاتی تھیں جن میں سے حضرت عمرؓ نے بعض مسلمانوں کو اقطاع یا جاگیرات دیں۔ ان زمینوں پر جو کسان قابض تھے ان سے بھی خراج حسبِ شرحِ مقررہ وصول کیا جاتا تھا لیکن ان کی تقسیم بالکلیہ خلیفۂ وقت کے صوابدید پر تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان زمینوں کے مالک بظاہر جملہ حقوق ملکیت سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ان کی مقبوضہ زمینات سے انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ یہ بھی حق رکھتے تھے کہ زمین اپنے ورثا کو منتقل کر دیں۔ آپس میں وہ اپنی زمینوں کی خرید و فروخت بھی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ حقوق دو اہم شرائط کے تابع تھے۔ اوّلاً انھیں اس زمین پر خراج ادا کرنا پڑتا تھا جس کی تشخیص خلیفہ کے عمّال وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے اور جس کی شرح بلحاظ حالات بدلی جا سکتی تھی۔ دوسرے انھیں ممانعت تھی

کہ زمین کو وہ مسلمانوں کے ہاتھوں نہ فروخت کریں جس سے خراجی زمین عشری بن جائے اور نہ قبولِ اسلام کی صورت میں وہ خود خراج سے مستثنیٰ قرار دیے جا سکتے تھے۔ بجز اس کے کہ خلیفۂ وقت خاص طور سے انھیں خراج سے مستثنیٰ کر دے۔

مصر میں بھی حضرت عمرؓ نے جملہ اراضی کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا تھا۔ لیکن یہاں کی تمام زمینات کاشتکاروں کو لگان پر دے دی گئی تھیں۔ حضرت عمرو بن عاص کے زمانہ میں تشخیص لگان میں دریائے نیل کے مدّوجزر اور پانی کی کثرت وقلّت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اس طرح مصر میں تشخیص خراج کا طریقہ سواد سے جدا تھا۔ حکومتِ روما نے اپنے زمانہ میں مصریوں پر بہت بھاری ٹیکس عائد کیے تھے۔ چنانچہ قلیل سے قلیل نوع پیداوار پر رومی محصول لیتے تھے۔ مسلمانوں نے خراج کے علاوہ صرف گندم پر ٹیکس عائد کیا اور اس کی شرح بھی صرف دو فی صد تھی۔ حالانکہ رومی یہی ٹیکس دس فی صد کے حساب سے وصول کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کو زمین کی خریداری سے روک دیا تھا۔ اس لیے ان کے عہد تک جن مسلمانوں کے پاس زمینیں تھیں ان سے صرف عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے بعد ان کے اس قاعدہ پر عمل نہیں کیا گیا اور مسلمانوں نے کثرت سے

زمینیں خریدنی شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خراجی زمینیں عشری ہو گئیں اور حکومت کی آمدنی بہت گھٹ گئی۔ بالخصوص بنو اُمیہ نے اپنے دورِ حکومت میں شاہی خاندان کے افراد اور اپنے دوسرے حامیوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ یہ سلسلہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت معاویہؓ اور بالخصوص یزید اور عبدالملک کے دَور میں مسلمانوں میں جاگیرداری اور زمینداری کے فروغ کی کوئی حد نہیں رہی جس سے مسلمانوں کی حکومت کو بہت سخت مالی نقصان پہنچا۔ کیونکہ مسلمانوں سے اراضی کا محصول خراج کے بجائے عشر کی صورت میں لیا جاتا تھا جس کی شرح بہت کم تھی۔ سواد کی سرزمین تقریباً پوری کی پوری قریش کی جاگیر بن گئی یہاں تک کہ سعد بن العاص کہا کرتے تھے کہ سواد قریش کی ذاتی ملکیت ہے جس میں سے جتنا چاہیں لے لیں اور جتنا چاہیں چھوڑ دیں۔

مالسواد الابستان القریش فناخذ ما نشاء و نترك ما نشاء۔

بنو امیہ کے خلفا مثلاً، حضرت امیر معاویہ، عبد الملک، ولید، ہشام اور ان کے والی مثلاً حجاج، مسلمہ اور خالد قسری سلطنت کے سب سے بڑے جاگیرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ہشام اور اس کا عراقی گورنر خالد بن عبداللہ قسری اتنے بڑے زمیندار تھے کہ وہ غلّہ کے بھاؤ کو نہایت آسانی سے گھٹا بڑھا سکتے تھے۔ جب انھیں غلّہ کی قیمت میں

زیادتی سے فائدہ ہوتا تو اپنی جاگیروں کی زرعی پیداوار کو روک لیتے تھے اور جب یہ غلّہ کا نرخ گھٹانا چاہتے تھے تو اپنی جاگیروں کی پیداوار کو اس کثرت سے بازار میں لاتے تھے کہ بھاؤ گر جاتا۔ چنانچہ ان دونوں میں عرصہ تک تجارتی رقابت جاری رہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداری کا نظام جسے حضرت عمرؓ مٹانا چاہتے تھے مسلمانوں میں پوری طرح نشوونما پا چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خراجی زمین کثرت سے عشری زمین بن گئی اور اسلامی حکومت کا مالی نقصان بڑھتا گیا۔ ان حالات میں مسلمان مالکینِ زمین اور حکومت کے مابین یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ مسلمانوں سے خراج نہیں وصول کیا جائے گا۔ لیکن اجارہ کے نام سے ان پر ایک مساوی محصول عائد کیا جائے گا۔ اس طرح انھیں قانوناً ملکیت اراضی کا حق حاصل ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے مسلمانوں پر ملکیتِ اراضی کے بارے میں جو قانونی امتناع عائد کیا تھا اسے برخاست کر دیا گیا۔

نصر بن سیار نے جو خراسان کا گورنر تھا اپنے زمانہ میں ایک نئی اصلاح کی۔ وہ ہر ضلع سے محصول کی ایک مقررہ رقم وصول کرتا تھا خواہ اس ضلع کے مالکانِ زمین مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ اس طرح مسلمان اور غیر مسلم مالکانِ زمین پر یکساں محصول عائد ہو گیا اور خراجی اور عشری زمینوں کا فرق مٹ گیا۔

خراج کے علاوہ اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں سے جزیہ کا محصول لیا جاتا تھا۔ یہ محصول جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اسلام کی ایجادات میں سے نہ تھا بلکہ ایرانیوں اور رومیوں کے زمانہ میں بھی رعایا سے وصول کیا جاتا تھا۔ البتہ ایک بڑا فرق یہ تھا کہ ایرانی اور رومی سلطنتوں میں یہ محصول صرف عوام الناس سے لیا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد اور ان کے ملازمین، اُمرائے دربار اور بڑے بڑے عہدہ دار اور سر برآوردہ افراد نیز مذہبی طبقے اور فوج کے سپاہی اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اسلام نے شریف و رذیل اعلیٰ اور ادنیٰ کی تمیز اٹھا دی، اور طبقات کی بنا پر نہیں بلکہ مذہب کی بنا پر جزیہ وصول کیا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں جزیہ کی شرح ایک دینار فی کس تھی۔ حضرت عمرؓ کے دَور میں دولت مند غیر مسلموں سے چار دینار، متوسط درجہ کے لوگوں سے دو دینار اور غریبوں سے ایک دینار جزیہ لیا جاتا تھا۔ لیکن عورتیں، بچے، بوڑھے، مجنون اور معذور افراد اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اس کے علاوہ جو غیر مسلم فوجی خدمات انجام دیتے تھے ان کو جزیہ سے بری کر دیا جاتا نیز عیسائیوں کے راہبوں اور خانقاہ نشینوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ مصر کے عیسائیوں نے اس استثنا سے فائدہ اٹھانے کے لیے بڑی تعداد میں خانقاہ نشینی اختیار کرنی شروع کر دی اس لیے یزید اول کے زمانہ میں خانقاہوں پر بھی جزیہ عائد کیا گیا نیز راہبوں کو ممانعت

کر دی کہ وہ غیر راہبوں کو خانقاہوں میں پناہ نہ دیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں عیسائی راہبوں اور خانقاہ نشینوں کو پھر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا۔ مصریوں سے جزیہ انفرادی طور پر وصول کیا جاتا تھا یعنی ہر آبادی کے لیے جزیہ کی ایک رقم مقرر کر دی گئی تھی۔ اگر اس کی تعداد اشخاص میں اضافہ ہوتا تو جزیہ کی مقدار بڑھا دی جاتی تھی اور اگر آبادی میں کمی واقع ہوتی تو جزیہ کم کر دیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس انتظام سے فائدہ اٹھا کر مصر میں قبطیوں نے جزیہ کی تشخیص کے زمانہ میں ایک آبادی سے دوسری آبادی میں منتقل ہونا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب جزیہ کے رجسٹرات مرتب کیے جاتے تو ان کے نام اس مقام کے رجسٹر سے حذف کر دینے پڑتے جہاں ان کی مستقل سکونت تھی لیکن جس مقام پر وہ منتقل ہوتے وہاں کے رجسٹرات میں ان کے نام درج نہیں کیے جا سکتے تھے کیونکہ مقامی آبادی ان مفرورین کو چھپا دیتی تھی۔ اس عمل کی وجہ سے بنو اُمیہ کے زمانہ میں غیر مسلم مفرورین پر کڑی نگرانی کرنی پڑی اور ہر آبادی کے حاکم پر یہ لازم کر دیا گیا کہ وہ مفرورین کا رجسٹر تیار کرائے۔

جزیہ اور خراج کی وصولی میں تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اسلامی قانون کی رُو سے جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا وہ

جزیہ اور خراج دونوں سے مستثنیٰ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے جو قاعدہ جاری کیا تھا اس کے لحاظ سے حکومت اُسے اور اس کے اہل و عیال کو بیت المال سے وظیفہ یا مشاہرہ دیتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک اس قاعدہ پر عمل درآمد کرنا آسان تھا۔ کیونکہ اس وقت تک اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد محدود تھی لیکن بعد میں جب غیر مسلم رعایا کثرت سے مسلمان ہونے لگی تو اس طریقہ پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا۔ کیونکہ نومسلموں کے جزیہ اور خراج سے مستثنیٰ ہونے کے باعث بیت المال کی آمدنی میں تدریجاً کمی ہوتی گئی۔ دوسری طرف اگر ان نومسلموں کو بیت المال سے وظائف بھی دیے جاتے تو حکومت پر اور زیادہ مالی بار پڑتا۔ یہ مسئلہ خلفائے راشدین کے زمانہ ہی میں نازک صورت اختیار کر گیا تھا کیونکہ عراق اور ایران کے سرحدی قبائل جو عربوں کے ہم نسل تھے اسی زمانہ سے مسلمان ہونے لگے تھے۔ صرف عام آبادی میں اس وقت تک اسلام کی جانب رجحان نہیں پیدا ہوا تھا۔ بنوامیہ کے دَور میں یہ صورت باقی نہیں رہی۔ عراق اور ایران کے شرفا اور متوسط درجہ کے زمینداروں نے جو ساسانی دَور حکومت میں جزیہ سے مستثنیٰ تھے اس محصول کی ادائیگی پر مسلمان ہونے کو ترجیح دی۔ بلاذری کا بیان ہے کہ جلولا کی جنگ کے بعد اکثر دہاقین نے اسلام قبول کر لیا۔ اسی مؤرخ کے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ نے ان نومسلموں

کو جزیہ سے تو بری کرادیا، لیکن خراج سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ بلاذری نے ابن رفیل کے واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جس نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا۔ حضرت عمرؓ نے (۲۰۰) درہم اس کا وظیفہ مقرر کیا اور جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا لیکن خراج معاف نہیں کیا۔ اس طرح جتنے دہاقین اسلام لائے تھے ان سب کے وظائف مقرر کر دیے گئے تھے۔ بلاذری نے یہ بھی لکھا ہے کہ اصفہان کے دہاقین نے جو مقامی قلعوں کے محافظ تھے عربوں کی اطاعت کا عہد کر لیا اور خراج دینے پر بھی راضی ہو گئے لیکن جزیہ دینے کو وہ لوگ باعث ننگ و عار سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے سر برآوردہ طبقات اور اہلِ فوج وغیرہ کے اسلام لانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ جزیہ کوئی بھاری محصول تھا یا مسلمان بنظرِ تحقیر ان سے یہ محصول لیتے تھے بلکہ چونکہ ساسانی عہد میں ان لوگوں کو جزیہ سے مستثنیٰ کر کے ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں کے تحت جزیہ دینے کو یہ لوگ باعث ذلت خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ساسانی عہد میں جو لوگ جزیہ نہیں ادا کرتے تھے انھوں نے اسلام لانا پسند کیا لیکن عام لوگ جو اس زمانہ میں بھی جزیہ سے مستثنیٰ نہ تھے بدستور اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہے۔

بنو امیہ کے دور میں عام لوگ بھی بکثرت مسلمان ہونے لگے جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ اموی حکومت کی آمدنی گھٹ گئی۔ یہ نومسلم موالی کہلاتے تھے اور اپنے کو کسی نہ کسی عرب قبیلہ سے وابستہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وظائف کی تقسیم قبیلوں کے لحاظ سے عمل میں آتی تھی۔ اس لیے جو لوگ کسی عربی قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے مسلمان ہونے کے بعد بھی انھیں وظیفہ حاصل کرنا دشوار ہوتا تھا۔ جب لوگ کثرت سے مسلمان ہونے لگے تو ہر شخص کے لیے عرب کے قبائل سے رشتہ قائم کرنا ناممکن ہوگیا۔ اس کثیر نومسلم آبادی کو جو کسی خاص قبیلہ سے متوسل نہ تھی موالیِ اسلام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بنوامیہ کے زمانہ میں ان نومسلموں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ لوگ عموماً کاشتکار ہوتے تھے جو اپنی زمینوں کو چھوڑ کر دیہات سے شہروں میں اس توقع پر منتقل ہو جاتے تھے کہ تبدیلیٔ مذہب کے باعث ان کے وظائف مقرر کیے جائیں گے۔ جیساکہ حضرت عمرؓ کے قاعدہ کی رُو سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اموی حکومت کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اتنی کثیر تعداد میں نومسلموں کو وظائف دے۔ ان میں سے جو موالی تعلیم یافتہ ہوتے تھے یا جن میں نظم ونسق کی قابلیت ہوتی تھی ان کے لیے معاش کا مسئلہ دشوار نہ تھا بلکہ بنوامیہ کے عہد میں ان میں سے اکثر نے بڑے بڑے رتبے حاصل کیے۔ مثلاً ۱۰۱ھ میں افریقہ کا گورنر یزید بن ابی مسلم موالی تھا۔ اسی طرح ہارون ابن سیاوش جو خراسان کا فوجی کمانڈر تھا اسی طبقہ سے

تعلق رکھتا تھا۔ ایک اور موالی صالح بن عبدالرحمان حجاج کا وزیر مال تھا۔ بنوامیہ کے زمانہ میں محکمہ جات حکومت کے بڑے بڑے افسر، اہل کار اور زمینوں کے نگران کار موالی تھے۔ لیکن عام نومسلموں کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ یہ لوگ دیہاتوں سے شہر میں آکر بالکل بے وسیلہ اور بے معاش ہو گئے تھے۔ بالخصوص بصرہ اور کوفہ میں ان کی کثرتِ تعداد اموی حکومت کے لیے خطرناک ہوتی جاتی تھی کیونکہ یہ لوگ بڑی آسانی سے مخالفین حکومت یعنی خوارج اور شیعوں کے آلہ کار بن جاتے تھے۔ بنوامیہ کے دشمن ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے ان سے بڑے بڑے وعدے کرتے تھے۔ مثلاً ان سے کہا جاتا تھا کہ اگر حکومت کی باگ ڈور امویوں کی بجائے خوارج یا شیعوں کے ہاتھ میں آجائے تو انھیں حکومت کی طرف سے وظائف دیے جائیں گے۔ جب سے بنوامیہ نے اُن کو محروم کر دیا تھا۔ اس خطرہ کو رفع کرنے کے لیے حجاج نے نومسلم موالی پر نہ صرف جزیہ عائد کر دیا بلکہ اکثروں کو گرفتار کر کے دیہات واپس کر دیا۔

بنوامیہ کے دور میں فرات کی بیشتر زمینوں کے مالک مسلمان ہو گئے اور دوسری زمینیں بھی بڑی تعداد میں غیر مسلموں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کو مل گئیں۔ قاعدہ کے لحاظ سے یہ زمینیں خراجی نہیں بلکہ عشری ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن حجاج نے ان کو خراجی زمین قرار دیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حجاج کے برخلاف اپنے زمانہ میں ان زمینوں کو پھر عشری قرار دیا۔ عمر بن عبد العزیز کے بعد ابن ہبیرہ نے حجاج کی تقلید کی اور ان زمینوں سے خراج وصول کیا۔ خلیفہ ہشام نے ان میں سے بعض زمینوں کو عشری قرار دیا۔ پھر عباسی خلیفہ مہدی نے ان سب کو عشری بنا دیا۔ ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں کے زمانہ میں خراج، عشر اور جزیہ کے بارے میں کسی ایک معینہ طریق کار پر عمل نہ ہو سکا بلکہ حالات کے اقتضا سے مسلمان فرماں رواؤں کو سابقہ طریقوں میں ترمیم و تجدید کرنی پڑی۔

اسلامی عہد میں جس طرح غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا اسی طرح مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی تھی جس کی شرح ڈھائی فی صد تھی۔ ضرورت کی تمام اشیا مثلاً مکان لباس، سواری، برتن، غلام جن سے گھریلو خدمات لی جاتی تھیں اور استعمال میں آنے والے ہتھیار وغیرہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے۔ نیز سونے اور چاندی کے علاوہ ہیرے، یاقوت، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے۔ زکوٰۃ صرف بالغوں اور صحیح الحواس افراد پر واجب تھی۔ لیکن بعد کے زمانہ میں امام غزالیؒ نے اس سے اختلاف کیا۔ امام صاحب کی رائے میں مجنون اشخاص کا مال بھی قابلِ زکوٰۃ ہے کیونکہ زکوٰۃ اشخاص پر نہیں بلکہ مال پر ہے۔ اسی طرح

غلہ کے علاوہ زمین کی دوسری پیداوار پر بھی زکوٰۃ کے بارے آگے چل کر اختلاف رائے پیدا ہوا۔ امام شافعی صرف انگور اور کھجور پر زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ تمام پھلوں پر زکوٰۃ وصول کی جانی چاہیے۔ سامانِ تجارت پر بھی اسلام کے زمانہ میں زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ لیکن اس معاملے میں بھی علما کا اختلاف ہے کہ سال بھر کے بعد تاجروں کے پاس جو نقد رقم بچ رہے اس پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں۔ عام رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ صرف سامانِ تجارت ہی پر نہیں بلکہ اس ساری نقدی پر بھی واجب ہے جو تاجروں کے پاس سال بھر کے بعد جمع ہو۔ اس کے علاوہ مویشیوں پر بھی زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب گھوڑوں کی تجارت کو فروغ ہوا اور لوگ اس تجارت سے بکثرت نفع حاصل کرنے لگے تو اس تجارت کو بھی قابلِ زکوٰۃ قرار دیا گیا۔ معادن یعنی کانوں پر بھی پانچواں حصہ بطورِ زکوٰۃ حکومت وصول کر لیتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا کل نظام حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں صرف اموالِ ظاہر پر زکوٰۃ وصول کی اور بقیہ اموال کی نسبت یہ حکم دیا کہ ان کی زکوٰۃ ان کے مالک اپنے طور پر ادا کریں۔ اس طرح کچھ اموال پر جن کی

تشخیص آسانی سے ہو سکتی تھی اسلامی حکومت زکوٰۃ وصول کرتی تھی اور بقیہ اموال کی زکوٰۃ انفرادی طور پر مسلمان خود ادا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عثمانؓ کے طریقہ کو بدل کر حضرت عمرؓ کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے زمانہ میں کل اموال کی زکوٰۃ عمالِ حکومت وصول کرتے تھے۔

بیت المال کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ عشور کی رقم تھی۔ یہ محصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رائج نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ابتدا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی جبکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے خلیفۂ وقت کو اطلاع دی کہ مسلمان تاجروں سے اس سامان پر جو وہ غیر مسلم ممالک میں تجارت کی غرض سے لے جاتے ہیں ایک محصول تجارت وصول کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ جو غیر مسلم تاجر اسلامی سلطنت میں سامانِ تجارت لے کر داخل ہوں، ان سے اسی شرح کے مطابق ٹیکس لیا جائے جس شرح پر مسلمان تاجروں سے غیر مسلم ممالک میں محصول لیا جاتا تھا۔ بعد میں یہ ٹیکس حربی غیر مسلموں کے علاوہ ایسے مسلمان تاجروں اور ذمیوں سے بھی وصول کیا گیا جو غیر مسلم ممالک میں تجارت کا سامان لے جاتے تھے۔ مسلمانوں سے عشور بشرح ڈھائی فی صد اور ذمیوں سے پانچ فی صد وصول کیا جاتا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ تک بیت المال کی آمدنی کے لیے علیحدہ علیحدہ مدات نہیں قائم کیے گئے تھے۔ بلکہ سب آمدنیاں ایک ہی جگہ جمع ہوتی تھیں۔ لیکن عمر ثانی نے خمس، صدقات اور فے کے لیے علیحدہ علیحدہ شعبے قائم کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرض دار اشخاص کا قرض ادا کرنے کے لیے بیت المال میں ایک خاص مد قائم کی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے تمام مسلمانوں کو بیت المال سے وظیفہ یا مشاہرہ دیا جاتا تھا خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب۔ کیونکہ اسلامی حکومت کی تمام مسلم رعایا کو ضرورت کے وقت فوجی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں اور مقررہ اوقات پر فوجی مشق اور تربیت کے لیے حاضر رہنا پڑتا تھا۔ لیکن جب شام، عراق اور مصر میں لوگ بکثرت مسلمان ہونے لگے تو بنو اُمیّہ کے لیے اس طریقہ پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا کیونکہ اگر ہر نو مسلم کو حکومت وظیفہ دیتی تو اس کا خزانہ خالی ہوجاتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اصلاحات اس لیے بھی ناکام رہیں کہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریق کار اختیار کرنے کی کوشش اور یہ نہیں دیکھا کہ حالات میں کتنا بڑا فرق ہوگیا ہے۔ چنانچہ نو مسلموں کی کثرتِ تعداد کے باوجود انھوں نے عرب اور غیر عرب مسلمانوں کے مابین وظائف کی تقسیم میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس سے حکومت کے خزانے پر

غیر معمولی بار پڑا۔ یہ بار اور زیادہ غیر معمولی اس لیے ہو گیا کہ انھوں نے نو مسلموں سے جزیہ کی وصولی کو حکماً بند کر دیا تھا۔ اس طرح ایک طرف تو حکومت کی آمدنی گھٹتی گئی اور دوسری طرف تقسیم وظائف کے دائرے کی وسعت کے باعث اس کا خرچ بہت بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے وہ تمام زائد ٹیکس بھی موقوف کر دیے جو بنو امیہ نے اپنے زمانے میں عائد کیے تھے۔ مثلاً محصول اکمنہ، محصول عرائض نویسی اور پن چکیوں کا محصول۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ نو مسلموں کا جزیہ معاف کر دینے اور انھیں وظائف دینے کی صورت میں حکومت کی آمدنی میں بہت زبردست تخفیف ہو جائے گی۔
اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ بنو اُمیہ نے جو زائد ٹیکس عائد کیے تھے انھیں برقرار رکھا جاتا اور اس کے علاوہ مزید ٹیکس لگائے جاتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو نو مسلموں کو جزیہ معاف کر دینے اور انھیں بیت المال سے وظائف دینے کے بعد بھی حکومت کا مالیہ درست رہتا۔

اسلامی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے کسی فرد کو فاقہ کشی میں مبتلا ہونے نہیں دیتی تھی۔ خلفائے راشدین کے زمانہ سے ہر معذور، بیوہ، یتیم، ضعیف اور نادار شخص کو حکومت سے گزارہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ بنو اُمیہ کے دَور میں بھی جاری رہا۔

ہشام کے زمانہ میں تمام لولے لنگڑے، اپاہج، ضعیف اور معذور افراد کے نام حکومت کے رجسٹرات میں درج تھے اور انھیں باقاعدہ وظیفہ ملتا تھا۔ اسلام کا یہ کارنامہ اتنا شاندار ہے کہ اس کی مثال تاریخ میں کسی اور جگہ نہیں ملتی ہے اور آج بھی جبکہ تہذیب و تمدن نے اتنی زبردست ترقی کرلی ہے دنیا کی اکثر سلطنتیں معاشی عدل کے اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ مسلمان تو مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غیر مسلموں کے لیے بھی یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ ان کے معذور، ناکارہ اور ضعیف افراد کو بیت المال سے گزارہ دیا جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ قرآن مجید میں جہاں صدقات کے ضمن میں مساکین کا لفظ آیا ہے اس سے اہلِ کتاب کے وہ افراد مراد ہیں جو ضعیف، ناتواں یا معذور ہوں۔ خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حیرہ کی فتح کے وقت غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

وجعلت لهم ایما شیخ ضعف العمل اذا اصابه آفة من الآفات او كان غنيا فافتقر وصار اهل دينه يتصدقون عليه طرحت جزيته وعيلت من بيت المال المسلمين وعياله ما اقام بدار الهجرة و دار الاسلام فان خرجوا الى غير دار الهجرة ودار الاسلام فليس

علی المسلمین النفقۃ علیٰ عیالھم۔

اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا شخص کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی آفت آجائے یا پہلے دولت مند تھا اور پھر غریب ہو جائے اور اس کے ہم مذہب افراد اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کو اور اس کی اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے امداد دی جائے گی لیکن اگر وہ غیر ملک میں چلا جائے تو مسلمانوں پر اس کے اہل و عیال کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔

یہ قاعدہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی جاری رہا بلکہ خلیفہ ثانی نے قرآن سے اس مسئلہ کا استنباط کر کے اسے اور پختہ کر دیا۔

اسلام کے معاشی احکام اور عہدِ جدید کے تقاضے

گزشتہ صفحات میں ہم نے اسلامی عہد کے معاشی حالات کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ اس زمانہ کے معاشی مسائل کیا تھے اور اسلام نے انھیں کیونکر حل کیا۔ اس تجزیہ سے ایک اہم نتیجہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے عہدِ حکومت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی احکام میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ کیا گیا اور تبدیل شدہ حالات کے تقاضوں کو پوری طرح مدِ نظر رکھا گیا۔ البتہ بعض صورتوں میں یہ ترمیمات اصولِ اسلام کے منافی تھیں۔ مثلاً نو مسلموں سے جزیہ کی وصولی لیکن اکثر صورتوں میں جہاں خلفائے راشدین نے ترمیم و اضافہ کیا وہاں یہ ترمیمات اور اضافے دین کے اصول و کلیات پر مبنی تھے۔ لیکن اس واقعہ سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حضور رسالت مآبؐ کے احکام میں اضافہ اور ترمیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کی فتوحات کے بعد انھیں جن معاشی مسائل سے سابقہ پڑا ان کی نوعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مسائل سے مختلف تھی۔ عہدِ رسالت

میں اسلامی حکومت کے حدود عرب سے آگے نہیں بڑھے تھے اور اسلام کو زرعی معیشت کے مسائل سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کیونکہ عرب میں زراعت کا رقبہ بہت محدود تھا اور لوگ تجارت یا گلہ بانی کے ذریعہ معاش حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عرب میں بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیریں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس کے برخلاف جب اسلام، روم اور ایران پر فتح یاب ہوا تو مسلمانوں کو ایک ترقی یافتہ زرعی معیشت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایران، عراق، شام اور مصر میں بڑے بڑے قطعاتِ اراضی اور جاگیریں چند افراد کے ہاتھوں میں تھیں اور کاشتکاروں کے حقوق نہایت بے دردی سے پامال کیے جاتے تھے اس لیے اسلامی حکمرانوں کو لازماً ان طریقوں میں ترمیم و اضافہ کرنا پڑا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں کام لیا تھا۔ ان میں سے بنو اُمیہ نے جو ترمیمات اور اضافے کیے وہ کسی مذہبی یا اخلاقی اصول پر مبنی نہ تھے بلکہ اس میں عربی قومیت اور طبقاتی امتیازات کا پیدا کردہ جذبۂ تفوق کام کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف خلفائے راشدین اور بالخصوص حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقوں پر جو اضافے یا ترمیمات کیں ان میں سے کوئی بھی دین کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ تھی۔ مثلاً حضرت عمر کا یہ اجتہاد و اضافہ کہ انھوں نے مفتوحہ علاقوں کی اراضی کو اہلِ فوج میں

تقسیم نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو اپنی سلطنت میں زمین کی خریداری اور حصول جائداد سے روک دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا۔ کیونکہ آنحضرت نے خود مسلمانوں کو زمینیں اور اقطاع عنایت فرمائے تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل جو بظاہر خلاف سنت معلوم ہوتا ہے، اصولِ اسلام کی رُو سے نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حینِ حیات اس خطرہ کا سامنا نہ تھا کہ مسلمان مجاہدانہ زندگی اور تبلیغ اسلام کا فریضہ ترک کر کے بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار بن بیٹھیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو جو زمینیں عطا فرمائی تھیں ان کا رقبہ اس قدر محدود تھا کہ مسلمان خود تو ان اراضی پر کاشت کر سکتے تھے مگر زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح آرام و فرصت کے ساتھ غریب کاشتکاروں کی کمائی سے استفادہ کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا۔ عراق اور شام کی مفتوحہ اراضی کو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اہلِ فوج میں تقسیم کر دیا جاتا تو مسلمانوں میں نظامِ زمینداری اور جاگیرداری کی تمام خرابیاں پیدا ہو جاتیں اور یہ لوگ تبلیغِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے فریضہ سے غافل ہو کر امیرانہ راحت طلبی میں پڑ جاتے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

طریقہ کو تبدیل کرنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں محسوس کی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مسئلہ یونہی پیش آتا تو آپ بھی حضرت عمرؓ کی مانند تقسیم اراضی کے مطالبہ کو نامنظور کر دیتے اور مسلمانوں کو زمینات خریدنے سے منع فرما دیتے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ دینے سے انکار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل میں تبدیلی فرمائی مگر یہ اجتہاد بھی جو تقاضائے وقت کے مدنظر کیا گیا تھا اصولِ اسلام کے منافی نہ تھا۔ اگر پیروی سنت اور اتباع شریعت کے معنے وہ ہوتے جو آج کل سمجھے جاتے ہیں تو حضرت عمرؓ جیسی ہستی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار میں تبدیلی کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اور نہ دیگر صحابہ اس امر کے روادار ہوتے کہ جس بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے جائز اور ضروری ثابت کر دیا تھا اسے محض تبدیلیٔ حالات کی وجہ سے ترک کر دیا جائے۔ پھر یہی نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ و صدقات کی آمدنی میں سے اہلِ کتاب کے معذور اور ضعیف افراد کو گزارہ دینے کا جو فیصلہ کیا اس کی بھی کوئی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں نہیں ملتی ہے۔ اگر خلفائے راشدین سنتِ نبوی کی سند کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرتے ہوتے تو ان سے اس قسم کے اجتہادات ہرگز سرزد نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرام کسی

معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت صرف اسناد کو مدنظر نہیں رکھتے تھے بلکہ نئے حالات اور ضروریات کا بھی خیال کرتے تھے۔ البتہ وہ یہ احتیاط ضرور کرتے تھے کہ ان کا فیصلہ دین کے اصول و کلیات پر مبنی ہو اور روحِ اسلام کے منافی نہ ہو۔ جہاں ان کی کسی ترمیم و تجدید سے اصولِ اسلام کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا وہ ایسے اقدام سے گریز کرتے۔ اب آج کل کے جدید حالات اور تقاضوں میں ہم کو بھی یہی اصول اور طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر ہم ہر معاشی، سیاسی اور تمدنی مسئلہ میں نظائر اور اسناد کی تلاش کرتے پھریں تو ہماری یہ کوشش یقیناً ناکام ہوگی۔ کیونکہ ہمارے مسائل کی نوعیت ان مسائل سے بالکل جُدا ہے جو عہدِ اسلامی میں مسلمانوں کو پیش آئے تھے۔

اس نوبت پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام سے کیا مراد ہے۔ آیا اس اصطلاح کا اطلاق ان جزوی یا فروعی احکام پر ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث میں پائے جاتے ہیں یا اس سے مراد وہ اساسی اصول ہیں جن پر یہ تفصیلی احکام و قوانین مبنی ہیں اور جن کا ذکر بھی اکثر صورتوں میں قرآن میں پایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر اسلام عہدِ جدید میں پیدا ہوتا اور اسے موجودہ معاشی مسائل سے سابقہ پڑتا تو وہ بعینہٖ وہی احکام دیتا اور وہی قوانین

نافذ کرتا جو عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں جاری کیے گئے تھے یا مقتضیاتِ وقت کے لحاظ سے ان میں ترمیم اور تبدیلی کرتا۔ مثلاً غلامی کے مسئلہ کو لیجیے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں غلامی کو جائز قرار دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام کو یہ رسم سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ اس نے اس رواج کو کم کرنے اور مٹانے کے لیے جو سخت قواعد وضع کیے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حالات پر اس کا بس چلتا تو وہ اُسے بالکل نیست و نابود کر دیتا۔ لیکن جس عہد میں اسلام ظہور پذیر ہوا تھا اس میں غلامی کا رواج اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا اور ساری دنیا کا معاشی نظام اس رواج کے دامن سے ایسا مضبوط بندھا ہوا تھا کہ اگر عہدِ رسالت میں اسلامی حکومت مشرق و مغرب کے تمام ملکوں تک پھیلی ہوئی ہوتی تب بھی وہ یک لخت اور بیک جنبشِ قلم اس کو مسدود کرنے سے عاجز رہتی۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں یہ صورتِ حال بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائے خلافتِ راشدہ تک اسلامی حکومت صرف عرب تک محدود تھی اور غلامی کا رواج ایران، روم، شام اور مصر غرض کہ مہذب دنیا کے ہر گوشہ میں موجود تھا۔ اس لیے اسلام نے صرف اس کے شدائد اور مظالم کی تخفیف پر توجہ کی اور جزوی اصلاحات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تو کیا اس سے یہ بات بھی

ثابت ہوتی ہے کہ اگر اسلام کو موجودہ حالات ملتے اور اس رسم کو مٹا دینے سے کسی عالمگیر بدنظمی یا معاشی اختلال کا امکان نہ ہوتا تب بھی غلامی کے متعلق وہ وہی احکام دیتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے زمانہ میں دینے پڑے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو زمینداری اور جاگیرداری کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اسلام نے ایک خاص عہد کے حالات و مقتضیات کے مدنظر اس نظام کو روا رکھا تھا اس لیے اس کی یہ اجازت آج بھی جوں کی توں قائم رہنی چاہیے اور اس میں کسی تبدیلی، ترمیم یا اضافہ کا خیال کرنا کفر، الحاد اور بے دینی ہے۔ حالانکہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے حتی المقدور مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو حصولِ اراضی سے بھی روک دیا۔ درحقیقت اس مسئلہ میں دو انتہا پسند گروہ عدل و توازن کے نقطہ سے ہٹ کر اسلامی احکام کی صحیح تعبیر کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ ایک گروہ اشتراکیت زدہ مسلمانوں کا ہے جس کا خیال یہ ہے کہ اگر اسلام اس زمانہ میں ظہور پذیر ہوتا تو وہی کچھ کرتا جو روس اور چین نے کیا ہے۔ دوسرے گروہ کی نمائندگی وہ لوگ کرتے ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر اسلام کو موجودہ زمانہ ملتا تب بھی اس کے طریق کار اور جزوی احکام میں کوئی تغیر نہ ہوتا بلکہ وہ من و عن وہی کرتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں

کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ دور کے تبدیل شدہ حالات میں بھی اسلام کے انہی احکام اور قوانین پر عمل ہونا چاہیے جو عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں نافذ کیے گئے تھے اور ان میں ترمیم و اضافہ کی کوشش کفر، دہریت اور اشتراکیت کے مترادف ہے۔

یہ دونوں نقاطِ نظر غلط ہیں۔ اسلام چند بنیادی اصولوں اور کلیات کا نام ہے نہ کہ جزوی اور فروعی احکام کا۔ اس لیے اگر اُسے زمانہ جدید کے حالات ملتے تو وہ ان بنیادی اصولوں سے عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق نئے جزوی احکام و قوانین مرتب کرتا۔ وہ اشتراکیت کے پیش کردہ حل کو یقیناً رد کر دیتا کیونکہ یہ حل اشتراکیت کے تصورِ حیات اور اس کے بنیادی اصولوں سے مستنبط کیا گیا ہے۔ لیکن وہ ابتدائے اسلام کے جزوی اور فروعی قوانین کو بھی نہ اختیار کرتا کیونکہ یہ قوانین اگرچہ اسلامی اصولوں سے ماخوذ تھے لیکن ان کے استخراج و استنباط میں اس زمانہ کے مخصوص حالات کا بھی بڑا دخل تھا جو آج ناپید ہو چکے ہیں۔ زمینداری، جاگیرداری اور دیگر معاشی مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں اسناد اور نظائر کی صرف اس حد تک ضرورت ہے جہاں تک ان سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر روشنی پڑتی ہے لیکن خود ان اسناد اور نظائر میں اب کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کے وہ بنیادی اصول اور کلیات کیا ہیں جن

کی مدد سے ہم اس زمانہ کے معاشی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اصولوں کو اخذ کرنے کے لیے ہمیں قرآن، سنت اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل پر غور کرنا اور یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کون سی باتیں وقتی حالات و مصالح کے اقتضا سے عمل میں آئی تھیں اور کون سے امور اصولی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا اطلاق اس زمانہ کے حالات پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے قرآن و حدیث پر غور کیا جائے تو حسبِ ذیل اصول مستنبط ہوتے ہیں:

اوّلاً اسلام نے اپنے زمانہ میں جن امور کی صرف اجازت دی تھی لیکن جن کے متعلق اس نے کوئی سلبی یا ایجابی حکم نہیں دیا، ان کے بارے میں ملّتِ اسلامی بلحاظ حالات نئے فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔

دوم: اسلام نے مال اور زمین کی انفرادی ملکیت کا حق قائم رکھا تھا اور جہاں تک اس کا منشا سمجھ میں آسکتا ہے وہ آئندہ بھی اس حق کو قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ انفرادی ملکیت کا لامحدود حق نہیں دیتا ہے بلکہ اس کا مطالبہ ہے کہ ہر قسم کی دولت (جس میں عطیات فطرت بھی شامل ہیں) جو افراد کی واجبی ضروریات سے زیادہ ہو معاشرتی سود و بہبود کے کاموں پر صرف کی جانی چاہیے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۝ (آل عمران: ۹۲)

تم نیکی نہیں حاصل کرتے ہو جب تک اس چیز کو خدا کی راہ میں نہ صرف کرو جو تم کو محبوب ہے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (التوبۃ : ۳۴)

جو لوگ سونا چاندی (یعنی مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اُسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب کی خبر سنا دو۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ ○ الذی جمع مالاً وعددہ ○ یحسب ان مالہ اخلدہ ○ (الھمزہ : ۱، ۲، ۳)

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کے لیے جو مال جمع کرتا ہے اور اُسے گنتا ہے۔ یہ شخص سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ باقی رہے گا۔

ان آیات سے صاف اور صریح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص زائد مال و دولت کو جس میں اس کی ذہنی اور عملی قابلیتیں بھی شامل ہیں مفید سماجی کاموں میں نہیں لگاتا ہے اس کے انفرادی حقِ ملکیت کا محض اس لیے لحاظ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسرے مذہبی فرائض مثلاً نماز اور زکوٰۃ پابندی سے ادا کرتا ہے بلکہ اسٹیٹ اُسے اس امر پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنا مال یا اپنی قابلیتیں دوسرے انسانوں کی بھلائی کے کاموں میں لگائے۔

اس جبر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اسٹیٹ اس سے محصول لے سکتی

ہے یا اُسے جبری خدمات پر مامور کر سکتی ہے یا اس کے حقِ ملکیت کو محدود کر سکتی ہے۔ بالکل یہی صورت زمین کی ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس زائد از ضرورت زمین ہو جسے وہ بیکار ڈال رکھے یا ایسے طریقوں سے اس کا استعمال کرے کہ اس کی پیداوار گھٹ جائے تو حکومت اس سے یہ زائد زمین بجبر حاصل کر کے دوسرے افراد میں تقسیم کر سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

قال کان لرجال من فضول ارفین علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکانوا یواجرونہا علی النصف و الثلث و الربع فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ ارض فلیزرعہا اولیمنح اخاہ فان ابی فلیمسک۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں عموماً لوگ، نصف، تہائی یا چوتھائی پر اپنی زمینوں کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے کسی بھائی کو دے دے اور اگر اس سے وہ انکار کرتا ہے تو رُک جائے۔

اس حدیث سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اتنی ہی زمین اپنی ملکیت میں لیں جتنی پر وہ کاشت کر

سکیں یا اپنے افرادِ خاندان کے ذریعہ کاشت کروا سکیں۔ اس سے زیادہ زمین کی ملکیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ناپسند تھی جیسا کہ یہ حدیث ظاہر کرتی ہے۔ آپ نے اپنے زمانہ میں زائد اراضی کی منصفانہ تقسیم کے لیے اگر قانون اور حکومت کا وسیلہ استعمال نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ تک یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہوا تھا اور معدودے چند افراد کو چھوڑ کر بہت کم لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمین تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مبارک میں اس مسئلہ کے متعلق کوئی قانون نہیں بنایا لہٰذا اب تا قیامت اس کے بارے میں کوئی نیا حکم نہیں دیا جا سکتا ہے۔

سوم: اسلام پیدائش دولت کے عوامل (FACTORS OF PRO-DUCTION) میں محنت اور سرمایہ کو مساوی اہمیت دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف جس کا نظریہ یہ ہے کہ پیدائش دولت میں اضافہ کرنے کے لیے صرف سرمایہ کی حوصلہ افزائی ضروری ہے اسلام کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں اور کارکنوں کی بھی اتنی ہی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے جتنی سرمایہ کی۔ یعنی مزدوروں کو معقول اجرت دی جانی چاہیے جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اسی کے ساتھ انھیں اتنی فرصت بھی ملنی چاہیے کہ وہ تفریحی مشاغل میں حصّہ لے سکیں۔ نیز ناکارگی کی صورت میں جو کسی اتفاقی حادثہ

کی وجہ سے واقع ہو انھیں اسٹیٹ کی طرف سے گزارہ ملنا چاہیے۔ یہ اصول ہم اس مشہور حدیث سے اخذ کرتے ہیں جس میں غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تائید کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت اید یکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل و یلبسہ مما یلبس ولا تکلفھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم۔

تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں جو تمھارے ہاتھ کے نیچے ہیں۔ پس جس کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو اس پر واجب ہے کہ اُسے وہی کھلائے اور پہنائے جو وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے اور ان سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت سے باہر ہو پھر اگر ان سے ایسا کام لو تو ان کی مدد بھی کرو۔

یہ حدیث غلاموں کے متعلق ہے لیکن اس کا اطلاق آج کل کے مزدور پیشہ اور محنت پیشہ افراد پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں مزدور طبقہ کی بالکل وہی حیثیت ہے جو اسلام کے عہد میں غلاموں کی تھی۔ یہ لوگ تقریباً اتنے ہی بے بس ہیں جتنے قدیم زمانہ میں غلام ہوتے تھے اور ان کی محنت سے سرمایہ دار اور مال دار طبقات اتنا ہی استفادہ کرتے ہیں جتنا غلاموں سے ان کے آقا کیا کرتے تھے۔ اس لیے جب غلاموں کے متعلق حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکید ہے کہ انھیں وہی کھلاؤ

اور پہناؤ جو خود کھاتے اور پہنتے ہو ان سے اتنا زیادہ کام نہ لو کہ وہ بالکل تھک کر چور ہو جائیں تو یہ حکم مزدور طبقہ کے افراد پر بھی اسی طرح منطبق ہوتا ہے۔

چہارم: اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ معاشرہ کے غریب، معذور، ضعیف، بیمار اور قرض دار اشخاص کو یا یتیموں اور بیواؤں کو بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے اور ان کی پرورش کی ذمہ داری نہ افراد قبول کریں اور نہ اسٹیٹ۔ اس غرض سے اسلام نے اپنے زمانہ میں زکوٰۃ کا حکم دیا تھا جس کی اصل روح یہ تھی کہ معاشرے کے کمزور افراد کو اجتماعی طور سے مالی امداد دی جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بلکہ بنو امیہ کے دور تک مسلمانوں کی سوسائٹی کا یہ حال تھا کہ اس میں ہر معذور، ضعیف، بیمار، قرضدار، یتیم اور بیوہ کو بیت المال سے گزارہ کی رقم دی جاتی تھی۔ یہی اصول آج بھی مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے اور اگر زکوٰۃ کی رقم موجودہ حالات میں ناکافی ثابت ہو تو یا تو اس کی شرح میں اضافہ کر کے مزید رقم حاصل کی جاسکتی ہے یا دوسرے محصولات عائد کیے جاسکتے ہیں۔

پنجم۔ اسلام نے ہر قسم کے سود کو صاف الفاظ میں منع کر دیا ہے۔ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کے تباہ کن اثرات پر غور کرنے کے بعد کوئی دیانت دار شخص اس امر سے اختلاف نہیں کرے گا کہ اس نظام نے دنیا کو جن آفات و مصائب میں مبتلا کیا ہے ان کی تہ میں سود کا اصول کارفرما ہے اور اگر

اسلامی احکام کے مطابق سود کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے تو سرمایہ داروں کے مظالم کا نہایت آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ششم۔ ایسی اشیا اور وسائل دولت جو براہِ راست حکومت کی دفاعی تیاریوں سے تعلق رکھتے ہوں یا افادہ عام کے لیے ضروری ہوں یا جن پر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنے سے معاشرے کے عام افراد تنگی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں انھیں اجتماعی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کی تائید میں ایک حدیث تو وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابیض بن حمال نامی ایک صحابی کو یمن میں ایک چشمہ جاریہ عطا فرمایا لیکن جب لوگوں نے شکایت کی کہ اس سے تمام آبادی تکلیف میں مبتلا ہو جائے گی تو آپ نے اپنی اجازت منسوخ فرما دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے اجتماعی ملکیت کے اصول کو کہیں ناجائز نہیں قرار دیا ہے اور نہ صاف و صریح الفاظ میں اس کی ممانعت کی ہے۔ اگرچہ جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں اسلام کا یہ منشا نہیں ہے کہ انفرادی ملکیت کے دائرہ کو اتنا محدود اور تنگ کر دیا جائے کہ اس سے افراد کی جائز آزادیاں بالکل سلب ہو جائیں، اور وہ حکومت کے مقابلہ میں بالکل عاجز اور بے بس ہو کر رہ جائیں۔ لیکن اسلام کے متعلق یہ دعویٰ کرنا بھی غلط ہے کہ اس میں اجتماعی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک محدود دائرے

کے اندر اور مخصوص اغراض و مقاصد کے لیے اسلام اجتماعی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ ویسے بھی فقہا نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اگر کسی شے کی ذاتی ملکیت سے افادۂ عامہ میں خلل واقع ہو یا عامۃ الناس تنگی اور تکلیف میں مبتلا ہوجائیں تو اس پر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے:

ملك احد بالاحتجار ملكاً منعه فضاق على الناس فان اخذ العوض عنه اغلاها فخرج عن المواضع الذى وضعه الله من تعميه ذوى الحوائج من غير كلفته۔ (المغنی)

اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک ہوجائے تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام ضیق اور تنگی میں مبتلا ہوجائیں گے اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے گراں کردے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس غرض کے لیے اس چیز کو جو مقام عطا کیا تھا وہ چیز اس سے ہٹ جائے گی یعنی عام حاجت مندوں کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری نہ ہوگی۔

اسی طرح علامہ ابن قدامہ نے نمک، گندھک، مومیائی اور مٹی کے تیل وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر انفرادی ملکیت نہیں تسلیم کی جاسکتی ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

لا تملك بالاحياء ولا يجوز اقطاعها من الناس

ولا احتجارها دون المسلمین لان فیه ضرر للمسلمین وتضییقاً علیہم۔

نہ آباد کرنے اور نہ حکومت سے جاگیر ملنے کی صورت میں ان کا کوئی مالک ہو سکتا ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہو گی۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کی تعمیر میں مندرجہ بالا اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں معاشی خرابیوں اور ناانصافیوں کی بہت کم گنجائش رہ جائے گی اور ان اصولوں پر جو نظام تعمیر کیا جائے گا وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مفسدات سے پاک ہو گا کیونکہ اس میں افراد کی معاشی آزادی بھی قائم رہے گی اور اس کے ساتھ اسٹیٹ کو اتنی طاقت بھی حاصل ہو گی کہ وہ معاشرتی سود و بہبود کی غرض سے انفرادی ملکیت پر پابندیاں عائد کر سکے۔ البتہ ایسے نظام میں اسٹیٹ اتنی طاقتور بھی نہ ہو گی کہ وہ افراد کی جائز آزادیوں کو سلب کر کے انھیں بالکل غلام بنا دے۔

جہاں تک اس اصول کا تعلق ہے کہ اسلام نے جن باتوں کا صریحی حکم نہیں دیا ہے اور نہ صریحی ممانعت کی ہے ان کے بارے میں ملّتِ اسلامی نئے فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے بہت کم مسلمانوں کو اختلاف ہو گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان امور کے بارے میں ملّت کا جو نیا فیصلہ

ہو گا وہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور کلیاتِ دین سے اخذ کیا جائے گا اور ان کے منافی نہ ہو گا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو جو آزادی اسلام نے عطا کی ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ اپنی خواہشات و اغراض کے مطابق جیسا چاہیں عمل کریں بلکہ اس دائرہ میں بھی ان پر یہ لازم ہے کہ وہ ان حدود سے متجاوز نہ ہوں جو دین کے بنیادی اصول و کلیات سے مستنبط ہوتے ہیں۔ دوسرے اصول کی بابت بھی بہت کم مسلمانوں کو اختلاف ہو گا یعنی اس امر کے متعلق کہ اسلام نے ذاتی ملکیت کے حق کو قائم رکھا ہے لیکن یہ حق لامحدود نہیں ہے بلکہ ضروریاتِ وقت اور مصالح ملت کے لحاظ سے اس پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اب صرف اختلاف اس امر میں باقی رہ جاتا ہے کہ انفرادی ملکیت پر کس حد تک اور کن طریقوں سے پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اس مسئلہ میں ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کو صرف انہی طریقوں اور اسی حد تک محدود کیا جا سکتا ہے جن کا ثبوت قرآن اور احادیث سے ملتا ہے۔ یعنی مسلمانوں پر زکوٰۃ لگائی جا سکتی ہے اور قانونِ وراثت کا نفاذ کر کے اجتماعی دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آ سکتی ہے لیکن دولت اور ملکیت کو محدود کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا جا سکتا ہے جو اسلامی عہد میں مستعمل نہ تھا۔ اگر اس گروہ کے استدلال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس زمانہ میں کوئی اسٹیٹ اسلامی اصولوں

پر نہیں چلائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ آج کل کے زمانہ میں اسٹیٹ کی ذمہ داریوں اور فرائض کا دائرہ اسلامی عہد کی اسٹیٹ کے دائرہ فرائض سے بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اسی نسبت سے اس کے وسائل آمدنی بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔ یہ وسائل صرف اسی حالت میں بہم پہنچائے جا سکتے ہیں جب افراد کی آمدنیوں پر بہت زیادہ محصولات عائد کیے جائیں یا انفرادی ملکیت کے حق کو محدود کیا جائے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں لوگوں پر صرف چند محصول لگائے تھے، اور ان کے حق ملکیت کو تقریباً آزاد چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں اسٹیٹ کے فرائض کا دائرہ صرف دفاع اور قیامِ امن تک محدود تھا۔ اس لیے آج کے زمانہ میں جبکہ اسٹیٹ کو تعلیم، طبی امداد اور مواصلات وغیرہ کے متعلق بہت وسیع ذمہ داریاں اپنے سر لینی پڑتی ہیں کوئی اسٹیٹ صرف انہی وسائل آمدنی پر اکتفا کرے جو اسلامی عہد میں جائز تصور کی جاتی تھیں یا انفرادی ملکیت کے حق کو صرف اتنا ہی محدود کرے جتنا اسلام نے اپنے زمانہ میں کیا تھا تو وہ مالی حیثیت سے ایک دن بھی کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی صورت ملکیت زمین کی بھی ہے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں زمین کی ملکیت پر کوئی قید نہیں عائد کی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں قابلِ کاشت زمین کا رقبہ محدود تھا اور کسی شخص کے پاس اتنی زمین نہ تھی جو اس کی ضروریات سے بہت زیادہ

ہو۔ پورے عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے دو خلفا کے عہد میں ایک بڑے زمیندار اور جاگیردار کا بھی وجود نہ تھا جس سے یہ اندیشہ ہوتا کہ ملک کی بیشتر زمین چند افراد کے ہاتھوں میں مجتمع ہو جائے گی۔ آج کل کے بڑے بڑے ملکوں میں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ قابلِ زراعت زمین کا رقبہ نہ تو اتنا محدود ہے کہ کسی شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہی نہ ہو اور نہ اتنا وسیع کہ تمام زراعت پیشہ افراد کو ان کی ضرورت کے مطابق زمین مل سکے۔ ایسی صورت میں زمین کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ معاشرہ کی ترقی اور بہبودی کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ درحقیقت زمین کا مسئلہ آبادی کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دارومدار اس پر ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ کتنا پڑ رہا ہے۔ جس وقت امریکہ میں انگریز اور فرانسیسی نوآبادکار داخل ہوئے ان کے سامنے زمین کا رقبہ اتنا محدود تھا کہ جس کے ہاتھ جتنی زمین آئی اس نے لے لی۔ اس طرح غیر محدود انفرادی ملکیت کے اصول پر عمل کرنے سے نوآبادکاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوتا گیا زمین کے مسئلہ نے دوسری نوعیت اختیار کر لی۔ اب اگر کسی ملک میں آبادی زیادہ اور زمین کا رقبہ محدود ہو تو کیا اس میں چند افراد کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ زمین کے بیشتر حصہ کے بلاشرکتِ غیرے مالک بن بیٹھیں اور انسانوں کی ایک بہت

بڑی اکثریت کو مزدوری پیشہ کاشت کاروں کی حیثیت سے استعمال کریں۔ اور کیا ایسے حالات میں اسٹیٹ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے چند افراد کے حق ملکیت کو محدود کر دے۔ اگر یہ چیز خلافِ اسلام ہے تو پھر کون مسلمان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا مذہب حق و انصاف اور معاشرتی عدل کا علم بردار ہے۔ حالانکہ قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا جس سے ثابت ہو کہ اسلام ایسے حالات میں تحدید ملکیت کے اصول کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اگر ہمارا موجودہ زمیندار اور جاگیر دار طبقہ اپنی مملوکہ زمینوں کی صحیح طور پر دیکھ بھال کرتا اور زرعی پیداوار کی ترقی اور اضافہ کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرتا جن سے اہلِ ملک کی غذائی اور زرعی ضروریات بہتر طریقہ سے پوری ہوتیں تب تو ملکیتِ زمین کی تحدید کا اصول اختیار کرنے میں ایک اخلاقی اور معاشرتی نقصان کا اندیشہ تھا۔ لیکن یہ لوگ اضافۂ پیداوار یا زمین کی قوتِ پیداوار کو بہتر کرنے کے بجائے اپنی غفلت اور تساہل سے اسے روز بروز ناکارہ اور غیر پیدا آور بنا رہے ہیں اور اس طرح اس مقصد اور غرض کی نفی کر رہے ہیں جس کے لیے قدرت نے زمین میں نمو اور پیداوار کی قوت رکھی ہے۔ ایسی صورت میں زمین پر ان کے حقِ ملکیت کی تحدید نہ کرنا معاشرہ کے حق میں صریحاً ظلم ہے۔ سوال یہ ہے کہ

کیا اسلام اس ظلم کو جائز رکھتا ہے اور اسلامی اصولوں کے لحاظ سے کیا یہ بات پسندیدہ اور مستحسن ہے کہ اشیا کو جن اغراض و مقاصد کے لیے قدرت نے پیدا کیا ہے اگر کوئی فرد یا جماعت انھیں نقصان پہنچائے جب بھی اس کے حقوق ملکیت کا احترام روا رکھا جائے اور معاشرہ کے اجتماعی حق کا کچھ خیال نہ کیا جائے۔ کیا حضرت عمر کی خلافت میں ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں کہ آپ نے کسی شخص کو کسی خاص مقصد کے لیے زمین عطا کی اور پھر اس بنا پر واپس لے لی کہ وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ اگر اس عمل کو محض اس بنا پر خلافِ اسلام قرار دیا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے زمانہ میں تحدید ملکیت زمین کا یہ مخصوص طریقہ استعمال نہیں کیا تھا تو اسی اصول کی بنا پر آج کل کی مسلمان حکومتوں کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ زکوٰۃ، عشر، خراج اور عشور کے علاوہ عوام الناس سے کوئی اور محصول وصول کریں جبکہ اسلام نے اپنے زمانہ میں ان چند محصولات کے علاوہ اور کوئی محصول مسلم رعایا سے نہیں لیا تھا۔ بالفاظِ دیگر کیا اس زمانہ میں یہ ممکن ہے کہ کسی حکومت کا طریق محصول اندازی من وعن وہی ہو جو اسلامی عہد میں تھا۔ ہمارے خیال میں آج کل کے زمانہ میں اگر کوئی مسلم یا غیر مسلم صرف مذکورہ بالا چار محصولوں پر اکتفا کرے تو وہ ایک روز کے لیے بھی اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے نئے

محصولات عائد کیئے گئے ہیں انھیں محض اس بنا پر غیر اسلامی یا مخالفِ اسلام نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہدِ رسالت یا خلافتِ راشدہ کے دَور میں یہ محصول نہیں لیے گئے تھے۔ پھر زمینداروں اور جاگیرداروں کی ملکیت کو محدود کرنے اور زمین کی منصفانہ تقسیم کے لیے اگر اس زمانہ میں نئی تدابیر اختیار کی جائیں تو انھیں محض اس وجہ سے کیونکہ منافیِ اسلام قرار دیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اپنے دَور میں یہ تدابیر نہیں استعمال کی تھیں۔ جو لوگ زمینداریوں اور جاگیروں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کے استدلال کی بنا پر حضرت عمرؓ کا یہ فعل بھی خلاف اسلام تھا کہ انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو حصولِ اراضی سے روک دیا۔ حالانکہ اس امتناع کے لیے سنتِ نبویؐ سے انھیں کوئی سند نہیں مل سکتی تھی کیونکہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں حصولِ اراضی پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی۔ لیکن حضرت عمر کے اس فعل پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سنت کا وہ مفہوم نہیں لیتے تھے جو آج کل کے علما لیتے ہیں۔ اور نہ وہ اس امر کو خلافِ شرع یا منافیِ اسلام سمجھتے تھے کہ حالات کی تبدیلی اور نئے تقاضوں کے مدِ نظر ان امور میں ترمیم و تجدید کی جائے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی صریح حکم نہیں دیا تھا۔

زمینداریوں اور جاگیروں کے بارے میں ہم نے جس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے وہی نقطۂ نظر بٹائی پر بھی صادق آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بٹائی کا طریقہ رائج تھا۔ لیکن ہم نے اوپر جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طریقہ ناپسند تھا اور آپ مسلمانوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ زائد زمین کو کرایہ پر دینے کی بجائے دوسرے مسلمان بھائیوں کو مفت دینا بہتر ہے۔ اگر عملی مجبوریاں راہ میں حائل نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ آپ اس طریقہ کو حکماً بند کر دیتے لیکن چونکہ اس زمانہ میں اس طریقہ کو مسدود کر دینے سے معاشی انتشار پیدا ہونے کا امکان تھا اس لیے آپ نے اس کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے بھی یہی تھی کہ بٹائی کا طریقہ ناجائز ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

لا یجوز المساقاۃ ولا المزارعۃ الا بالدراھم والدنانیر وما اشبھھما۔

بٹائی کا معاملہ اور کاشت کا معاملہ ہر دو صورت میں جواز کی شکل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کا درہم و دینار وغیرہ کی شکل میں بندوبست کیا جائے۔

یہ بات کہ مسلمان حکومتوں نے حضرت امام ابوحنیفہ کے اس

فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا اور فتویٰ حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کے فیصلہ پر دیا جاتا رہا۔ اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی ہے کہ بٹائی کا طریقہ منشائے اسلام کے خلاف تھا اور صرف عملی مجبوریاں اس کی ممانعت میں حائل تھیں۔

مسئلۂ سُود

سود کی ممانعت کے بارے میں آج کل دو گروہوں کے درمیان شدید اختلاف رائے ہے۔ ایک گروہ جو موجودہ نظامِ سرمایہ داری سے متاثر ہے دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام نے صرف غیر پیدا آور سود کو حرام کیا تھا یعنی اس سود کو جو حاجت مند افراد اپنی گھریلو اور خانگی ضرورتوں کے لیے ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کو دیتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے سود سے سوسائٹی کو بحیثیت مجموعی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے اس لیے یہ سود اسلام کے نزدیک ناجائز ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کاروباری اور صنعتی اغراض کے لیے جو قرض لیا جائے اس پر سود ادا کرنا پڑے۔ ان حضرات کے خیال میں یہ سود نہ صرف زمانہ جدید کے حالات میں جائز بلکہ ضروری ہے کیونکہ بینکنگ کا پورا نظام اس سود پر چل رہا ہے اور اس قسم کے سود کو جائز قرار دیے بغیر صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے سرمایہ کا حصول دشوار ہوگا۔ جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے اس بارے میں قرآن اور احادیث کی ہدایات

بالکل صاف وصریح ہیں اور ان میں کسی قسم کا ابہام یا اشتباہ نہیں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم صاف طور پر ہدایت کرتا ہے:

الذین یاکلون الربٰو لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس ۔ (البقرۃ، ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کی مثال ان لوگوں کی ہے جنھیں شیطان نے مخبوط کر دیا ہو۔

یمحق اللہ الربٰو و یربی الصدقٰت (البقرہ: ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

یٰایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربٰوا ان کنتم مومنین ہ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ ج (البقرۃ: ۲۷۸، ۲۷۹)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم یہ نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول ؐ سے لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

حدیث میں آتا ہے:

عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ۔

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کی دستاویز لکھنے والے اور گواہی دینے والے پر لعنت بھیجی ہے۔

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید فاذا اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بید۔

عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونے کو سونے، چاندی کو چاندی، گیہوں کو گیہوں، کھجور کو کھجور، جَو کو جَو اور نمک کو نمک سے برابر برابر بیچو اور خریدو۔ اگر ان اصناف میں اختلاف ہو تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو۔

عن عثمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الدینار بالدینارین ولا الدرھم بالدرھمین۔

عثمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دینار کو دو دینار اور ایک درہم کو دو درہموں سے نہ بیچو۔

ان آیات اور احادیث میں سود کی ممانعت صاف اور صریح الفاظ میں کی گئی ہے۔ نیز پیداوار اور غیر پیدا آور قرضوں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اسلام کا منشا یہ ہوتا کہ صرف خانگی اور گھریلو ضروریات کے

لیے سُودی لین دین کی ممانعت کر دی جائے تو وہ نہایت آسانی سے پیدا آور قرضوں کو اس امتناعی حکم سے مستثنیٰ قرار دیتا۔ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا آور قرضوں پر سُودی لین دین کا رواج نہیں تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے سُودی لین دین سے ناواقف تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ان دونوں اقسامِ سُود کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سُودی لین دین کی تہ میں جو بنیادی ذہنیت کارفرما ہے وہ دونوں صورتوں میں یکساں قائم رہتی ہے خواہ سُود پیدا آور اغراض کے لیے لیا جائے یا خانگی ضروریات کے لیے۔ جس طرح خانگی ضروریات کی صورت میں سُود لینے والے کو مدیون کی مالی استطاعت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے اور وہ یہ نہیں دیکھتا ہے کہ حاجت مند شخص ختمِ مدت پر سود کی رقم دے سکے گا یا نہیں۔ اسی طرح پیدا آور قرضوں میں بھی سود لینے والے افراد کو کوئی غرض نہیں ہوتی ہے کہ جس کاروبار کے لیے قرضہ حاصل کیا جا رہا ہے اس میں منافع ہو رہا ہے یا نقصان۔ دونوں صورتوں میں سُود خور کو صرف اپنے فائدہ سے غرض ہوتی ہے اور وہ قرضہ لینے والوں کے نفع نقصان میں شریک نہیں ہونا چاہتا ہے۔ اس طرح ہر دو حالتوں میں سُودی لین دین ایک خود غرضانہ اور نفع پرستانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ اس بنیادی ذہنیت

کے لحاظ سے جو معاشرتی احساس اور اصولِ اخوت کے قطعاً منافی ہے، پیداآور اور غیر پیداآور سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سود کی ممانعت کے متعلق ایک عام اعتراض یہ ہے کہ جب اشیا کی تجارت کو جائز قرار دیا گیا ہے تو پھر سود کو جو اصل کی تجارت ہے کیونکر ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے لگان کو جائز رکھا ہے۔ شراکت جس میں ایک حصہ دار صرف اصل لگاتا ہے، لیکن کاروبار میں عملی حصہ نہیں لیتا ہے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔ مکانات کا کرایہ حاصل کرنے کی بھی اسلام میں کوئی ممانعت نہیں ہے تو پھر سود لینے میں کیا حرج ہے۔

اس اعتراض کا جواب ایک عالمِ دین نے یہ دیا ہے:

"دنیا کے سارے کاروبار اور لین دین کے معاملات میں فریقین ایک دوسرے کے لیے کچھ قربانی کرتے ہیں مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے، اس کے معاوضہ میں خریدار سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے۔ کرایہ کی شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو جس وقت تک کرایہ دار اس کی موٹر کا استعمال کرتا ہے موٹر کے تمام کل پرزے اپنی صفاتِ کارکردگی بتدریج کھوتے رہتے ہیں۔ سال بھر کے بعد مکان جب کرایہ دار واپس کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر اور اجزا اس ہیئت میں

باقی نہیں رہتے ہیں جو کرایہ پر لیتے وقت ان کی تھی۔ الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اور چیزیں موٹر مکان وغیرہ کے مالک کو واپس ہو جاتی ہیں لیکن ان صفات کی قربانی ضرور ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپیہ قرض لیے اور دس سال بعد واپس کیے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپیہ کو اسی حالت میں واپس لیں گے جس حالت میں دس سال پہلے دیے تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس عرصہ میں روپیہ کی صفات پر کہنگی اور فرسودگی طاری ہوئی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ سود خور کو نہ اصل کی قربانی کرنی پڑتی ہے اور نہ مال کے صفات کی"۔[1]

نظامِ سرمایہ داری سود کے جواز میں ایک بہت بڑی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ سود کے بغیر لوگ اپنا سرمایہ بڑی مقدار میں صنعتی کاروبار میں نہیں لگاتے ہیں۔ اس لیے سرمایہ رکھنے والے افراد کو اس امر کی ترغیب دینے کے لیے وہ اپنا زیادہ سے زیادہ روپیہ اور دولت صنعتی اور تجارتی کاروبار میں لگائیں، سود کا جواز ضروری ہے۔ گویا کہ سود پیدا آور قوتوں میں اضافہ کا ایک نہایت اہم ذریعہ ہے اور اگر سود کو جائز نہ رکھا جائے تو پیدا آور قوتیں ایک خاص نقطہ پر ٹھہر جائیں گی اور اس سے پوری دنیا کو نقصان

---

[1] ماخوذ از "اسلام اور سود" مصنفہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔

پہنچے گا۔ اس دلیل سے بعض اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ پیدا آور قوتوں کی یک طرفہ توسیع کہاں تک انسانی نظمِ معیشت کی ترقی کے لیے ضروری اور فائدہ مند ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اب زمانہ کے حالات کا اقتضا کیا ہے۔ یہ کہ پیدا آور قوتوں میں مزید اضافہ کیا جائے یا عوام کی قوتِ صرف اور قوتِ خرید کو بڑھایا جائے اور دونوں میں سے کون سا عنصر انسان کی معاشی کارکردگی اور معاشرہ کی فلاح کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ تیسرے یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگوں کو صنعتی اغراض میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دینے کا یہ طریقہ فائدہ سے زیادہ نقصانات کا موجب نہیں ہوتا ہے اور کیا اس طریقہ کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا ہے جس سے اس کے مضرات بھی رفع ہو جائیں اور سرمایہ بھی کافی مقدار میں صنعتی اور کاروباری اغراض پر لگایا جا سکے۔

ان سوالات کا جواب دینے کے لیے ہمیں ان حالات پر نظر ڈالنی چاہیے جن میں اہلِ یورپ نے سُود کے جواز کا فیصلہ صادر کیا اور پھر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ انھیں اس کی وجہ سے کیا فوائد حاصل ہوئے۔ آیا یہ فوائد عام انسانیت کے نقطہ نظر سے مطلوب تھے یا ان سے صرف وہ قومیں مستفید ہوئیں جو اس زمانہ میں ترقی یافتہ آلاتِ پیدائش کی اجارہ دار تھیں۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان قوموں کے فوائد کے مقابلہ میں

پس ماندہ ممالک کے عوام کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ آخر میں ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جس زمانہ میں سودی لین دین کے جواز کی وجہ سے سرمایہ دار قوموں نے معاشی ترقی کی تھی اس زمانہ کے حالات اور موجودہ حالات میں کیا فرق ہے اور اس فرق کے باعث سودی لین دین کے مجموعی نفع اور نقصان پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟

سود کا سب سے بڑا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے لوگوں میں سرمایہ کا ذخیرہ کرنے کے بجائے مفید کاموں میں سرمایہ لگانے کی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ صنعت و حرفت میں لوگ سرمایہ اسی صورت میں لگاتے ہیں جب صنعتی ترقی کا میدان وسیع ہو رہا ہو، پیداوار بڑھ رہی ہو اور مزدوروں کی اُجرتیں ادا کرنے میں سرمایہ کی کم سے کم مقدار صرف ہوتی ہو۔ اگر صورت حال یہ نہ ہو بلکہ منڈیوں کی وسعت پذیری ختم ہو جائے، پیداوار کی مانگ گھٹ جائے اور مزدوروں کی اُجرت اور معیارِ زندگی میں ترقی کے باعث سرمایہ کا بیشتر حصہ اُجرتوں کی ادائیگی میں لگانا پڑے تو جس سودی نفع کی توقع پر سرمایہ دار طبقہ اپنا مال صنعت و حرفت میں لگاتا ہے اُس کے حصول کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ دار روپیہ لگانے پر آمادہ نہیں ہوں گے خواہ سود کی شرح میں کتنا ہی اضافہ

ہو جائے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں حالات ایسے ہی ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے اہل سرمایہ اپنا روپیہ صنعت و حرفت میں نہیں لگانا چاہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کو مفید کاموں پر صرف نیکی کرنے کی ترغیب سود سے نہیں بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت کے فروغ اور منڈیوں کی توسیع سے ہوتی ہے۔ مغربی تاریخ کے جس دور میں سُودی کاروبار اور بنکوں کا زور شروع ہوا اس میں نئی نئی ایجادات اور فنی ترقیوں کے باعث مزدوروں کی قوتِ پیداوار میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ آبادی میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا کہ مزدور پیشہ طبقہ میں حصولِ معاش کے لیے شدید مسابقت شروع ہو گئی۔ پھر مزدوروں کی کثرتِ آبادی اور ان کی باہمی مسابقت کے باعث اجرتوں میں معتد بہ تخفیف ہو گئی اور سرمایہ کا نہایت قلیل حصّہ اجرتوں کی ادائیگی پر صرف ہونے لگا۔ اس کے علاوہ اہلِ یورپ نے اپنی ترقیوں سے فائدہ اٹھا کر یکے بعد دیگرے پسماندہ ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس نو آبادیاتی توسیع سے ان کی پیداوار کے لیے نئی نئی منڈیاں کھل گئیں کیونکہ یوروپین سرمایہ دار جس ملک میں پہنچتا تھا وہاں کی مقامی صنعت و حرفت کو تباہ و تاراج کر دیتا تھا اور پسماندہ ملک کے عوام کو اتنے سستے داموں پر مال فراہم کرتا تھا کہ وہ اپنی مقامی صنعتی پیداوار کے مقابلہ میں بیرونی مصنوعات کو ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتے

تھے۔ غرض کہ انگلستان کے صنعتی انقلاب کے زمانہ میں مزدوروں کی قلّت اور بیرونی منڈیوں کے فقدان کا مسئلہ بیک وقت حل ہو گیا اور اس طرح صنعتی سرمایہ کے لیے نفع کا میدان بے انتہا وسیع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں سود کو جائز قرار دینے سے ان قوموں کو بے حد فائدہ پہنچا جو مشینی ایجادات اور فنی ترقی میں پیش پیش تھیں۔ کیونکہ سود کو جائز قرار دینے سے صنعتی کاروبار کے لیے وافر سرمایہ فراہم ہو گیا۔ لیکن اس زمانہ کے ماہرینِ معاشیات نے غلطی سے یہ فرض کر لیا کہ حالات ہمیشہ ایسے ہی سازگار رہیں گے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جو واقعات پیش آئے ان سے ظاہر ہو گیا کہ منڈیوں کی توسیع اور مزدوروں کی کثرت ایک حد کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف تو مزدور منظم ہوتے جا رہے ہیں اور ان میں مسابقت کے بجائے اجرتوں میں اضافہ کی غرض سے باہمی اتفاق و اتحاد بڑھتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف صنعتی منڈیوں میں توسیع کے بجائے تنگی پیدا ہو رہی ہے اور صنعتی پیداوار کی کھپت کا دائرہ وسیع ہونے کے بجائے سمٹتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح سود بڑھا دینے کے باوجود آج کل سرمایہ داروں سے صنعتی اغراض کے لیے قرضہ حاصل کرنا دشوار ہے کیونکہ سرمایہ داروں کو اب اس بات کا یقین نہیں رہا ہے کہ

وہ اپنے روپیہ پر اتنا نفع کما سکیں گے جتنی صنعتی توسیع کے دَور میں وہ کما سکتے تھے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں یورپین سرمایہ کے لیے ایشیائی ممالک، افریقہ اور امریکہ میں منافع کا میدان کتنا وسیع تھا اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اور فرانس وغیرہ کے قومی سرمایہ کا کتنا بڑا حصّہ اس زمانہ میں بیرونی ممالک پر لگایا گیا تھا۔ سب سے پہلے انگلستان کے سرمایہ داروں نے بیرونی حکومتوں کو قرضہ دینے اور ان سے سود وصول کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جب جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر و توسیع کے لیے انگریز سرمایہ دار بہت بڑے پیمانہ پر سرمایہ برآمد کرنے لگے۔ اس سے انھیں دو بڑے فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو ان کا روپیہ نفع بخش کاروبار میں لگ گیا جس سے انھیں بشکلِ سود نفع حاصل ہونے لگا۔ دوسرے اس کاروائی سے بیرونی منڈیوں کی وسعت میں اور زیادہ اضافہ ہوا اور برطانوی پیداوار کی کھپت کا ایک بہت بڑا ذریعہ پیدا ہو گیا کیونکہ جیسے جیسے ریلوں کی تعمیر ہوتی جاتی تھی آسٹریلیا، کینیڈا اور ہندوستان کے اندرونی حصّوں تک برطانوی مال کی رسائی ہوتی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان انگلستان سے سالانہ (۱۵۰) کروڑ پاؤنڈ کا سرمایہ برآمد ہوا۔ اس کے بعد کے زمانہ میں یہ رقم (۵۰۰) کروڑ پاؤنڈ سالانہ

تک پہنچ گئی۔ صرف امریکہ، کینیڈا، ارجنٹائن اور آسٹریلیا میں اس سرمائے کی وجہ سے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان ریلوں کی وسعت (۶۲۰۰) میل سے (۲۶۲۰۰۰) میل تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۴ء سے سات سال قبل کا جو زمانہ گزرا اس میں بھی برطانوی سرمایہ داروں نے بیرونی ممالک کی ریلوں میں (۶۰) کروڑ پاؤنڈ کا سرمایہ لگایا۔ ۱۸۷۳ء میں جو صنعتی سرد بازاری پیدا ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ بیرونی ممالک میں برطانوی سرمایہ کی کھپت کا دائرہ محدود ہوگیا۔ اس سے پہلے برطانوی سرمایہ داروں کو اندیشہ نہ تھا کہ انگلستان کی صنعتوں میں ضرورت سے زیادہ روپیہ لگانے کے باعث پیداوار کی کثرت اور خریداروں کی قلت کا مسئلہ پیدا ہوجائے گا کیونکہ ان کے زائد سرمایہ کی کھپت بیرونی ممالک میں ہوجاتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان برطانوی سرمایہ داروں نے مصر، روس، ہنگری، برازیل اور پیرو کی حکومتوں کو بڑے بڑے قرضے دیے تھے۔ اس کے علاوہ امریکی حکومت نے ریلوں کی تعمیر کے لیے جن قرضوں کا اعلان کیا تھا اس کا بھی ایک بہت بڑا حصہ برطانوی سرمایہ داروں نے فراہم کیا تھا۔ سر رابرٹ گریفن نے لکھا ہے کہ اس زمانہ تک برطانوی سرمایہ داروں کا محبوب ترین مشغلہ یہی تھا کہ وہ بیرونی ممالک میں اپنا سرمایہ لگا کر بڑے بڑے منافع حاصل کرتے تھے۔ لیکن اسی زمانہ میں اسپینی حکومت کی مالی حالت

خراب ہو گئی اور ادھر ترکی حکومت بیرونی قرضوں پر سود ادا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ ان واقعات نے دفعتہً بیرونی ممالک میں برطانوی سرمایہ کی کھپت کا سلسلہ روک دیا۔ اس کے باوجود ۱۹۱۴ء میں برطانوی سرمایہ داروں نے جتنا روپیہ بیرونی ممالک میں لگایا تھا وہ ان کے کل سرمایہ کے ایک ثلث کے برابر تھا۔ اس سرمایہ کا ایک بڑا حصہ برطانیہ کی نوآبادیات اور شمالی اور جنوبی امریکہ میں لگایا گیا تھا۔

اب اسلامی ممالک میں جو لوگ سود کو محض اس وجہ سے جائز قرار دینا چاہتے ہیں کہ اس طریقہ سے سرمایہ کے اجتماع اور فراہمی میں آسانی پیدا کر دی جائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں میں توسیع نہیں ہو سکتی ہے، انھیں یہ بتانا چاہیے کہ انگلستان اور مغربی ممالک میں صنعتی انقلاب کے زمانہ میں سرمایہ کے لیے جو سازگار حالات میسر تھے کیا وہ حالات اب بھی موجود ہیں اور کیا سرمایہ کی اتنی بڑی مقدار کی کھپت اس دور میں بھی ممکن ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ اسلامی ممالک کے مقابلہ میں دنیا کے دوسرے ممالک صنعتی حیثیت سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اس لیے ان ملکوں میں مسلمانوں کے سرمایہ کی کھپت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر کیا اسلامی ممالک کی اپنی نوآبادیاں اور مقبوضات ہیں جہاں ان ممالک کا سرمایہ نفع بخش کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ان دونوں

سوالات کا جواب نفی میں ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اسلامی ممالک کے لیے سرمایہ کی اتنی کثیر مقدار میں فراہمی بے ضرورت ہے جس کے لیے سود کو جائز قرار دے کر سرمایہ داروں کو خاص طور پر اجتماع دولت کی ترغیب دی جائے۔ جہاں تک خود اسلامی ملکوں کی صنعتی توسیع کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ ہے، ہمارے خیال میں اس کام کے لیے اتنے محدود سرمایہ کی ضرورت ہے کہ مشترکہ کمپنیوں کے قیام اور ان کے حصص کی اجرائی سے سرمایہ کی مطلوبہ مقدار باسانی فراہم کی جاسکتی ہے خود انگلستان اور دیگر مغربی ممالک میں صنعتی ترقی اور توسیع کے لیے جائنٹ اسٹاک کمپنیاں قائم کی جاتی ہیں۔ ان میں جو لوگ حصص خریدتے ہیں انھیں سود کے بجائے سالانہ منافع تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہی طریقہ ہمارے یہاں بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کی حکومتیں تعمیری اغراض کے لیے عوام اور سرمایہ داروں سے قرض لیں اور ان پر سود کے بجائے ہر پانچ یا دس سال بعد منافع تقسیم کریں۔ اس کے علاوہ ایک اور امر قابلِ غور یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جب کہ اسلامی ممالک میں سودی لین دین قانوناً جائز ہے عام طور پر یہ شکایت سُنی جاتی ہے کہ سرمایہ دار اور مال دار افراد اپنا روپیہ صنعتی کاموں پر نہیں لگاتے بلکہ تجارت اور سٹے میں اپنی دولت صرف کرتے ہیں تاکہ

جلد سے جلد اپنے روپیہ پر نفع کمالیں۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ سود کو جائز قرار دینے کے بعد بھی سرمایہ دار اور مال دار افراد صنعتی اور تعمیری کاموں میں روپیہ لگانے سے گریز کرتے ہیں اور سرمایہ کے اجتماع اور فراہمی کے لیے سود کی ترغیب ناکافی اور غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔ جبکہ سود کے جواز اور رواج کے باوجود بھی اہل سرمایہ صنعت و حرفت میں اپنا روپیہ نہیں لگا رہے ہیں اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ فی زمانہ نہ تو اتنے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ سود کے ذریعہ سرمایہ کی فراہمی ممکن ہے تو پھر سود کے جواز پر اصرار کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ ہمارے خیال میں اگر سود کو حکماً مسدود کر دیا جائے تو اس سے موجودہ صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں ہو گا، بلکہ بہت سی خرابیوں کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے زمانہ میں سود کے جواز کے باعث اتنے کثیر سرمایہ کی فراہمی عمل میں آنے سے معاشی اور صنعتی میدان میں جو ترقیاں ہوئیں ان کا فائدہ کس کو پہنچا۔ یہ یاد رہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان مسائل کی نوعیت قومی یا نسلی نہیں ہے بلکہ اسلام ایسے تمام مسائل کو انسانیت کے عالمگیر نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سودی کاروبار کی وجہ سے مغربی یورپ کے ممالک میں بڑی زبردست ترقیاں عمل میں آئیں لیکن محکوم اور پس ماندہ اقوام کو ان ترقیوں کی جو بھاری قیمت

پر عمل میں نہ آئے جس سے لوگ صنعتی اشیا اور پیداوار کی فاضل مقدار کو خرید کر اپنی ضروریات پر صرف کر سکیں۔ لیکن چونکہ سرمایہ داروں نے اپنے ذاتی اغراض اور منافع کی بنا پر معیشت کے اس پہلو سے غفلت برتی اس لیے جب پیداوار کی کثرت ہونے لگی اور اس کی کھپت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تو معاً تجارتی چکروں کا دور شروع ہوگیا اور صنعتی توسیع اور ترقی کا سلسلہ مسدود ہوگیا۔ اب سرمایہ داروں کو صنعت و حرفت میں مزید سرمایہ لگانے کی فکر نہیں رہی بلکہ ان کے سامنے سوال یہ پیدا ہوگیا کہ جو روپیہ وہ صنعت میں لگا چکے ہیں اسے نقصان سے کیونکر محفوظ کیا جائے۔ لیکن نقصان سے بچنے کی اور کوئی صورت انہیں اس کے سوا نظر نہیں آئی کہ اپنی پیداوار کو محدود کر دیں اور تجارت اور صنعت و حرفت کے دائرے کو وسیع کرنے کی بجائے تنگ کرتے جائیں۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ کارخانے بند ہونے لگے، صنعتی کساد بازاری کا دور شروع ہوگیا اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد بے کار ہوگئی۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودی لین دین کی وجہ سے جو توسیع و ترقی ہوتی ہے وہ نقصانات سے خالی نہیں ہے۔ ابتدا میں اس کی وجہ سے ایک محدود طبقے کے افراد کو بڑے بڑے منافع حاصل ہو جاتے ہیں لیکن پس ماندہ قوموں کو اس کی بہت

بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور خود ان قوموں میں جن کی صنعت وحرفت ترقی کرتی ہے عوام کی قوتِ خریداری میں متناسب اضافہ نہ ہونے کے باعث سرمایہ داروں کو بالآخر ان عارضی فوائد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اور صنعت وحرفت کے نظام میں برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر سود کو بالکلیہ منسوخ کر دیا جائے تو صنعتی اور تجارتی کاروبار کی توسیع کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کا جواب جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں یہ ہے کہ لوگ صنعتی اغراض کے لیے مشترکہ کمپنیاں قائم کر کے سرمایہ داروں اور عوام سے ان کا زائد مال حاصل کر سکتے ہیں اور نفع کی صورت میں ان کے حصص پر منافع تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے سرمایہ کی ایک کافی مقدار فراہم کی جا سکتی ہے جس سے متوسط درجہ کی صنعتیں چلائی جا سکتی ہیں۔ بڑے بڑے کاموں کے لیے جن میں کثیر سرمایہ کی ضرورت ہو گی حکومت اپنی مالی ساکھ پر عوام الناس اور مال دار افراد سے قرضے حاصل کر سکتی ہے۔ یہ قرضے اگر نفع بخش کاموں میں لگائے جائیں تو قرضہ دہندوں کو بھی نفع میں شریک کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسے تعمیری کاموں پر صرف کیے جائیں جن سے نفع کی کوئی توقع نہ ہو تو بھی حکومت باقساط ان قرضوں کی ادائیگی کا انتظام کر سکتی ہے اور زائد سرمایہ رکھنے والے اشخاص بنکوں

میں روپیہ رکھانے کے بجائے اسی سرمایہ کو میعادی امانت کے طور پر حکومت کے سپرد کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت کو قرضہ دینے کی صورت میں بھی ان کا روپیہ اتنا ہی بلکہ زیادہ محفوظ رہے گا جتنا بنک میں جمع کرنے یا گھروں میں ذخیرہ کرنے کی صورت میں۔ کہا جاتا ہے کہ منافع کی بنا پر تجارت اور صنعت و حرفت کی تنظیم کرنے سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور تجارتی اور صنعتی اداروں کو اپنی آمدنی اور خرچ کے حسابات مرتب اور پیش کرنے ہوں گے۔ لیکن یہ اعتراض اب کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ آج کل خود حکومتیں تاجروں اور صناعوں سے زائد منافع پر محصول لے کر انھیں تفصیلی حسابات رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر محصول زائد منافع کے لیے حسابات کی ترتیب و تکمیل کا انتظام کیا جا سکتا ہے تو سُود کی منسوخی کی صورت میں بھی یہی عمل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کی تجارت و صنعت سودی لین دین پر مبنی ہے۔ اس لیے جب تک ہماری معیشت بیرونی ممالک کی معیشت سے وابستہ ہے ہم سُود سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہماری مملکت اور ہمارے نظامِ زندگی کا دائرۂ اثر محدود ہے اور ہم بیرونی دنیا سے لین دین پر مجبور ہیں اس وقت تک ایک ناگزیر بُرائی کے

طور پر ہم بیرونی تجارت کے سلسلے میں سُود کو جائز رکھیں گے لیکن اپنی داخلی معیشت ایسی اساس پر قائم کریں گے کہ اس میں سے سُود کا عنصر ناپید ہو جائے۔ اگر کسی وقت اسلامی نظام دنیا کے ایک وسیع خِطّہ پر قائم ہو جائے اور ہم بیرونی ممالک کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور اور با اثر ہو جائیں تو اس وقت باقی دنیا کو بھی ہم اپنے اصولوں کی پیروی پر مجبور کر سکتے ہیں۔ جس طرح آج سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت ہمیں اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

ادا کرنی پڑی، اس کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس سُودی کاروبار اور صنعتی ترقی نے جس کا ظہور یورپ کے ممالک میں ہوا تھا مشرقی ممالک کو بالکل مفلس اور قلاش کر دیا اور اسی کی وجہ سے بالآخر یوروپین اقوام کے درمیان وہ معاشی اور سیاسی رقابت پیدا ہوئی جس نے ۱۹۱۴ء میں اور پھر ۱۹۳۹ء میں دو عالم گیر جنگوں کے شعلے بھڑکا دیے۔ محض اس امر کی بنا پر کہ سودی کاروبار سے چند مخصوص اور ترقی یافتہ اقوام کو بڑے زبردست منافع حاصل ہوئے، اس لعنت کو جائز قرار دینا انسانیت پر ایک ظلم عظیم ہے۔ کیونکہ اس سودی کاروبار نے افریقہ اور ایشیا کے انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کو یوروپین استعمار اور استحصال کا شکار بنا دیا۔ پھر خود ان ممالک میں جن کو ابتدائی زمانہ میں سودی کاروبار سے بے اندازہ فائدہ پہنچا تھا کچھ عرصہ کے بعد اس کے شدید نقصانات کا تجربہ ہونے لگا۔ اولاً سود کے جواز کی وجہ سے سرمایہ کی فراہمی میں جو غیر معمولی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں انھوں نے صنعتی ترقی کا دروازہ تو کھول دیا لیکن اس غیر معمولی توسیع اور غیر منضبط ترقی ہی نے بالآخر کثرتِ پیداوار کا مسئلہ پیدا کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پیداآور قوتوں میں ترقی اور توسیع کا فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عوام الناس کی قوتِ خرید میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

عوام کی قوتِ خرید میں کمی کے باعث صنعتی اشیا اور مصنوعات کی کھپت کا کوئی حقیقی اور مؤثر ذریعہ باقی نہیں رہتا ہے۔ سُود نے اہلِ سرمایہ کی جتنی ہمت افزائی کی اسی تناسب سے اس نے عوام کی قوتِ خرید کو نقصان پہنچایا۔ ابتدا میں سُودی کاروبار کی وجہ سے سرمایہ داروں کو بڑے بڑے منافع حاصل ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزید منافع حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں نے پیدا آور قوتوں کے اضافہ پر اور زیادہ سرمایہ لگانا شروع کیا۔ اس نفع پرستی کے جنون میں یہ لوگ اس حقیقت سے غافل ہوگئے کہ پیدا آور قوتوں کی اس غیر معمولی توسیع کی وجہ سے اشیا اور مصنوعات کی جو بہتات ہوگئی اس کی خریداری کون کرے گا۔ اگر مزدوروں، کارکنوں اور عام صارفین کی آمدنیوں میں مناسب اضافہ نہ کیا گیا۔ جب تک یورپ کی نو آبادیوں اور مقبوضات میں اس کثیر صنعتی پیداوار کی کھپت ہوتی رہی اس وقت تک سرمایہ داروں کو کثرتِ پیداوار کے خطرہ کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن جب پس ماندہ ممالک اور مشرقی مقبوضات میں بھی مزید صنعتی پیداوار کو جذب کرنے کی طاقت نہیں رہی، اس وقت ماہرینِ معاشیات کو محسوس ہوا کہ محض پیدا آور قوتوں میں اضافہ کرنے سے کوئی قوم ترقی اور خوشحالی کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی ہے، جب تک کہ قومی اور اجتماعی دولت کی تقسیم بھی ایسی منصفانہ بنیادوں

پر عمل میں نہ آئے جس سے لوگ صنعتی اشیا اور پیداوار کی فاضل مقدار کو خرید کر اپنی ضروریات پر صرف کر سکیں۔ لیکن چونکہ سرمایہ داروں نے اپنے ذاتی اغراض اور منافع کی بنا پر معیشت کے اس پہلو سے غفلت برتی اس لیے جب پیداوار کی کثرت ہونے لگی اور اس کی کھپت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تو معاً تجارتی جھگڑوں کا دور شروع ہو گیا اور صنعتی توسیع اور ترقی کا سلسلہ مسدود ہو گیا۔ اب سرمایہ داروں کو صنعت و حرفت میں مزید سرمایہ لگانے کی فکر نہیں رہی بلکہ ان کے سامنے سوال یہ پیدا ہو گیا کہ جو روپیہ وہ صنعت میں لگا چکے ہیں اسے نقصان سے کیونکر محفوظ کیا جائے۔ لیکن نقصان سے بچنے کی اور کوئی صورت ایسی اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ اپنی پیداوار کو محدود کر دیں اور تجارت اور صنعت و حرفت کے دائرے کو وسیع کرنے کی بجائے تنگ کرتے جائیں۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ کارخانے بند ہونے لگے، صنعتی کساد بازاری کا دور شروع ہو گیا اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد بے کار ہو گئی۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودی لین دین کی وجہ سے جو توسیع و ترقی ہوتی ہے وہ نقصانات سے خالی نہیں ہے۔ ابتدا میں اس کی وجہ سے ایک محدود طبقے کے افراد کو بڑے بڑے منافع حاصل ہو جاتے ہیں لیکن پس ماندہ قوموں کو اس کی بہت

بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور خود ان قوموں میں جن کی صنعت وحرفت ترقی کرتی ہے عوام کی قوتِ خریداری میں متناسب اضافہ نہ ہونے کے باعث سرمایہ داروں کو بالآخر ان عارضی فوائد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اور صنعت وحرفت کے نظام میں برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر سود کو بالکلیہ منسوخ کر دیا جائے تو صنعتی اور تجارتی کاروبار کی توسیع کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کا جواب جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں یہ ہے کہ لوگ صنعتی اغراض کے لیے مشترکہ کمپنیاں قائم کر کے سرمایہ داروں اور عوام سے ان کا زائد مال حاصل کر سکتے ہیں اور نفع کی صورت میں ان کے حصص پر منافع تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے سرمایہ کی ایک کافی مقدار فراہم کی جا سکتی ہے جس سے متوسط درجہ کی صنعتیں چلائی جا سکتی ہیں۔ بڑے بڑے کاموں کے لیے جن میں کثیر سرمایہ کی ضرورت ہو گی حکومت اپنی مالی ساکھ پر عوام الناس اور مال دار افراد سے قرضے حاصل کر سکتی ہے۔ یہ قرضے اگر نفع بخش کاموں میں لگائے جائیں تو قرضہ دہندوں کو بھی نفع میں شریک کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسے تعمیری کاموں پر صرف کیے جائیں جن سے نفع کی کوئی توقع نہ ہو تو بھی حکومت باقساط ان قرضوں کی ادائیگی کا انتظام کر سکتی ہے اور زائد سرمایہ رکھنے والے اشخاص بنکوں

میں روپیہ رکھانے کے بجائے اسی سرمایہ کو میعادی امانت کے طور پر حکومت کے سپرد کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت کو قرضہ دینے کی صورت میں بھی ان کا روپیہ اتنا ہی بلکہ زیادہ محفوظ رہے گا جتنا بنک میں جمع کرنے یا گھروں میں ذخیرہ کرنے کی صورت میں۔ کہا جاتا ہے کہ منافع کی بنا پر تجارت اور صنعت و حرفت کی تنظیم کرنے سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور تجارتی اور صنعتی اداروں کو اپنی آمدنی اور خرچ کے حسابات مرتب اور پیش کرنے ہوں گے۔ لیکن یہ اعتراض اب کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ آج کل خود حکومتیں تاجروں اور صناعوں سے زائد منافع پر محصول لے کر انھیں تفصیلی حسابات رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر محصول زائد منافع کے لیے حسابات کی ترتیب و تکمیل کا انتظام کیا جا سکتا ہے تو سُود کی منسوخی کی صورت میں بھی یہی عمل ہو سکتا ہے۔
اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کی تجارت و صنعت سودی لین دین پر مبنی ہے۔ اس لیے جب تک ہماری معیشت بیرونی ممالک کی معیشت سے وابستہ ہے ہم سُود سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہماری مملکت اور ہمارے نظامِ زندگی کا دائرۂ اثر محدود ہے اور ہم بیرونی دنیا سے لین دین پر مجبور ہیں اس وقت تک ایک ناگزیر برائی کے

طور پر ہم بیرونی تجارت کے سلسلے میں سُود کو جائز رکھیں گے لیکن اپنی داخلی معیشت ایسی اساس پر قائم کریں گے کہ اس میں سے سُود کا عنصر ناپید ہو جائے۔ اگر کسی وقت اسلامی نظام دنیا کے ایک وسیع خطّہ پر قائم ہو جائے اور ہم بیرونی ممالک کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور اور با اثر ہو جائیں تو اس وقت باقی دنیا کو بھی ہم اپنے اصولوں کی پیروی پر مجبور کر سکتے ہیں۔ جس طرح آج سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت ہمیں اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

اسلام اور اجتماعی ملکیت

اجتماعی ملکیت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کے متعلق بے حد غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں کا جو طبقہ اشتراکیت سے متاثر ہے وہ کسی نہ کسی طرح سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلام روسی اشتراکیت کی طرح انفرادی ملکیت کو قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو وہ فنی، معاشی اور انتظامی وسائل میسّر ہوتے جو اس زمانہ کی حکومتوں کو حاصل ہیں تو وہ انفرادی ملکیت کو بالکل ختم کر دینے سے دریغ نہ کرتے۔ یہ ان لوگوں کا قیاس محض ہے جس کے لیے وہ کوئی سند یا دلیل نہیں پیش کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایک انتہا پسند گروہ اتنی شد و مد سے انفرادی ملکیت کی حمایت کر رہا ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انفرادی ملکیت بھی روزہ، نماز اور حج و زکوٰۃ کی طرح ارکانِ اسلام میں داخل ہے۔ اور اگر ملکیت کے ذاتی اور خانگی حق کو کوئی صدمہ پہنچے گا تو خدانخواستہ اسلام بھی اس کے ساتھ ڈوب جائے گا۔ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے زمانہ میں انفرادی

اور اجتماعی ملکیت کے مسائل اس صورت میں نہیں پیش آئے تھے جس میں یہ مسائل آج کل ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لیے اسلام نے نفیاً یا اثباتاً ان کے متعلق کوئی صاف اور صریح حکم نہیں دیا ہے اور ملت کو آزادی دے دی ہے کہ وہ اسلام کے عمومی مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے حالات اور وقت کے مقتضیات کے مطابق جیسا چاہے عمل کرے۔ البتہ اسلام کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کی انفرادی اور شخصی آزادی قائم رکھنا چاہتا ہے اور ان میں فکر و عمل کی حریت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ غیر ضروری جکڑ بندیوں کو خواہ کسی دائرہ میں ہوں ناپسند کرتا ہے۔ اور انسانوں پر صرف اتنے ہی قیود عائد کرتا ہے جو تمدنی اور معاشی زندگی کے لیے بالکل ناگزیر ہوں۔ چنانچہ خود قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ انسانوں کو ان بے جا پابندیوں اور غیر ضروری قواعد و قوانین کی بندشوں سے آزاد کرانے تشریف لائے ہیں جو انھوں نے مصنوعی طور سے اپنے اوپر لگا رکھے ہیں۔ ایسا دین کسی ایسے نظامِ معاشی کو روا نہیں رکھ سکتا ہے جس میں تمام انسانوں کو اسٹیٹ کا غلام بنا دیا جائے اور ان کے وسائلِ رزق ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک اجتماعی ادارہ کو تفویض کر دیے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنی انفرادی آزادی اور حقوقِ ملکیت کا غلط استعمال بھی کر سکتا ہے اور

انفرادی ملکیّت کے قیام میں اس خطرہ کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن انسان کو حیوانیّت کے مرتبہ سے بلند کرکے اور اپنے آزاد اختیار کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دے کر خود خالقِ کائنات نے یہ خطرہ مول لیا ہے ورنہ اگر وہ چاہتا تو انسان کو بھی دوسرے موجودات کی طرح مجبور و مضطر بنا دیتا۔ اس کے علاوہ دنیا میں انفرادی آزادی کا قیام ارتقائے شخصیت کے لیے بے حد ضروری ہے اور چونکہ کمیونسٹ نظام میں انسان کے انفرادی حقوق کو جو ذاتی ملکیّت کی بنیاد ہی پر قائم رہ سکتے ہیں بالکل سلب کر لیا گیا ہے اس لیے ایسے معاشرہ میں ارتقائے شخصی کے امکانات بہت محدود ہیں۔ اسلام اس کے برخلاف انفرادی آزادی اور ارتقائے شخصیت کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانا چاہتا ہے اور انفرادی حقوق پر اسی صورت میں ہاتھ ڈالتا ہے جب ان کے غلط استعمال سے دوسرے افرادِ انسانی کی مساوی آزادی متاثر ہو یا ان کی شخصیّت کے ارتقا میں موانع پیدا ہوں۔ ان تمام اسباب کی بنا پر اسلام نے ذاتی ملکیّت کے بنیادی حق کو تسلیم کیا ہے اور اس حق کو وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائرہ میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے ذاتی ملکیّت کے حق کو لامحدود نہیں قرار دیا ہے اور معاشرہ کے حقوق کی حفاظت کے لیے ذاتی ملکیّت پر بعض پابندیاں بھی لگائی ہیں۔ ان پابندیوں

انفرادی حقِ ملکیت اور تحدیدات کا دائرہ کتنا وسیع ہو سکتا ہے جو اسلام نے انفرادی حقِ ملکیت پر عائد کی ہیں۔ اس کا دارومدار انسان کے اپنے رویہ اور طرزِ عمل پر ہے۔ جس سوسائٹی میں لوگوں کی اکثریت ذاتی ملکیت کے حق کو غلط طور پر استعمال کرتی ہے اور اس غلط استعمال کی وجہ سے دوسرے افراد کے یکساں حقوق کو صدمہ پہنچتا ہے یا ان پر ظلم ہونے لگتا ہے۔ وہاں لازماً انفرادی ملکیت کا دائرہ محدود کرنا ہوگا۔ البتہ جہاں انسان اخلاقی احساس سے اتنا بیگانہ نہ ہوا ہو کہ وہ انفرادی ملکیت کے حق سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے وہاں انفرادی ملکیّت کا دائرہ نسبتاً وسیع ہوگا۔ اس طرح اسلام میں انفرادی ملکیت کی آزادی اور تحدید کا دارومدار وقت کے حالات و مقتضیات اور انسان کے اخلاقی احساسات کی نشوونما پر ہے۔ وہ نہ کمیونسٹوں کی طرح اجتماعی ملکیت کے اصول کو ابدی، ناقابلِ تغیر، انمٹ اور جزو دین سمجھتا ہے، نہ ہی بعض اسلامی جماعتوں کی طرح انفرادی ملکیت کو دین کا بنیادی رکن خیال کرتا ہے جس کا توڑنا عمارتِ دین کو ڈھا دینے کے برابر ہو۔ اسلام ایک طرح کا درمیانی راستہ تجویز کرتا ہے جس میں حالات و مصالح کے اقتضا کے لحاظ سے انفرادی ملکیّت کے دائرہ کو وسیع یا تنگ کیا جا سکے۔ اس کے نقطۂ نظر سے نہ تو افراد کی ذاتی ملکیّت کا حق لامحدود ہے اور نہ اسٹیٹ کا حقِ تحدیدِ ملکیّت لامحدود ہے۔

اس بنیادی نکتہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے اجتماعی ملکیت کو کن حدود میں جائز رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور حدیث تو وہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آگ، گھاس اور پانی میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں:

الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار۔ لیکن ان تینوں کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی ہیں جن کو انفرادی ملکیت قرار دینے سے نقصانِ عام کا اندیشہ ہے۔ ان اشیا کے بارے میں فقہا نے لکھا ہے:

ملك احد بالاحتجار ملك منه فضاق على الناس فان اخذ العوض عنه اغلاه فخرج عن المواضع الذى وضعه الله تعميم ذوى الحوائج من غير كلفة۔

(المغنی)

اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک ہو جائے تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام ضیق اور تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حق تعالیٰ نے جس غرض کے لیے اس چیز کو جو مقام عطا فرمایا ہے وہ چیز اس سے ہٹ جائے گی اور عام لوگوں کی ضروریات بغیر تکلیف کے پوری نہ ہوں گی۔

علامہ ابنِ قدامہ نے اس سلسلہ میں حسبِ ذیل چیزوں کا ذکر کیا ہے جنھیں اجتماعی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے:

المعادن الظاهرة وهی التی یوصل مافیها من غیر مؤنة یتنابها الناس و ینتفعون بها کالملح و الماء والکبریت والقیر والمومیاء والنفت والکحل والیاقوت ومقاطع الطین واشباہ ذٰلک۔

ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں جن تک بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل ہو سکے۔لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ان پر جاری ہو اور لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہوں۔ مثلاً نمک، گندھک، ڈانبر، مومیائی، مٹی کا تیل یا سرمہ اور یاقوت۔

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان چیزوں کو اجتماعی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے:

لا تملك بالاحیاء ولا یجوز اقطاعها من الناس ولا احتجارها دون المسلمین لان فیه ضرابه بالمسلمین وتضیقاً علیهم۔

نہ آباد کرنے اور نہ حکومت سے جاگیر ملنے کی وجہ سے ان چیزوں کا کوئی مالک ہو سکتا ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کر دی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

ظاہری معادن کے علاوہ بعض فقہا نے اجتماعی ملکیت کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

لیس للامام ان یقطع ملکاً غنی المسلمین عنہ یعنی اذا کانت اجمۃ او غیضۃ او بحر یشربون منہ او محلۃ لاھل بلدہ فلیس للامام ان یقطع ذٰلک [1]

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں یعنی ان کی عام ضرورت ہو تو حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کو انھیں بطور جاگیر دے دے۔ مثلاً آبی نیستان ہو یا جنگل ہو یا دریا ہو جس سے پانی پیتے ہیں یا نمک بنانے کی جگہ ہو۔ جائز نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے دے۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ظاہری معادن کو جو سطح زمین کے قریب ہوں اجتماعی ملکیّت قرار دینے کا فتویٰ دیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

لاشك ان المعدن الظاهر الذی لایحتاج الی کثیر عمل اقطاعہ لواحد من المسلمین اضرار او تضیقاً علیہم۔

کوئی شک نہیں کہ ظاہری معادن جس کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں ایک عام مسلمان کی ملکیّت میں دے دینا عام مسلمانوں کے لیے تنگی کا باعث ہوگا۔

ان تمام اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اہل الرائے

---

[1] یہ تمام اقتباسات مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی کتاب "اسلامی معاشیات" سے ماخوذ ہیں۔

طبقہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انفرادی ملکیت ایسی اشیا پر تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے جو عام ضروریات سے متعلق ہوں اور جنھیں افراد کی ملکیت میں دے دینے سے آبادی کے ایک کثیر حصہ کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ اصول معدنی اشیا سے بطورِ خاص متعلق ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی عہد میں معدنی اشیا کی اہمیت اجتماعی نقطۂ نظر سے اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی آج کل ہے اور اس زمانہ میں بہت سی چیزیں مثلاً پٹرول وغیرہ سے عوام کی ضروریات متعلق نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے موجودہ زمانہ میں اجتماعی ملکیت کا دائرہ اس سے زیادہ وسیع ہوگا جتنا فقہا اور علما کی آرا کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔

جہاں تک معادن کا تعلق ہے ہمیں اس بارے میں ایک حدیث بھی ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر معدنیات پر اشخاص کی ذاتی ملکیت کا اصول قائم ہوگیا تو اس سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ مجمع الزوائد جلد ۴ میں حسبِ ذیل روایت ملتی ہے:

عن رجل من بنی سلیم عن جدہ ان اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بفضۃ فقال ھذہ من معدن لنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیکون معادن یحضرھا شرار الناس۔

بنی سلیم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے چاندی کا ایک ٹکڑا پیش کر کے کہا کہ یہ ہماری کان کا ہے - آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا جب معادن پر شریر لوگ قابض ہو جائیں گے ۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اسلامی عہد میں معادن پر انفرادی ملکیت قائم ہو جانے سے اتنے شدید نقصانات کا اندیشہ نہیں تھا جتنا آج کل ہے ۔ کیونکہ اس زمانہ میں کانوں کی صرف اس پیداوار سے استفادہ کیا جا سکتا تھا جو سطح سے قریب ہوتی تھی ۔ اس وقت ایسے ترقی یافتہ آلات و مشینیں موجود نہیں تھیں جن سے معادن کی گہرائیوں تک پہنچ کر ان کی دولت باہر نکالی جا سکتی ۔ آج کل کے ترقی یافتہ صنعتی دور میں یہ عمل آسان ہے، اس لیے یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر سونے چاندی یا لوہے اور فولاد وغیرہ کی کانوں کو افراد کی ملکیت میں دے دیا جائے تو وہ اس سے نہ صرف بے اندازہ دولت پیدا کر لیں گے بلکہ حکومت کو تسکیکِ زر اور دفاعی کاموں میں اس اجارہ داری کے باعث بے انتہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ آج کل کی حکومتوں کو جس پیمانہ پر دفاعی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں ان کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام معدنیات اسٹیٹ کی ملکیت میں آ جائیں جو براہِ راست دفاعی سرگرمیوں سے متعلق ہیں ۔ ایسی اشیا کو انفرادی ملکیت میں چھوڑ دینے سے جنگ کی صورت

میں زبردست نقصانات اور خطرات کا اندیشہ ہے۔ غرض کہ جملہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کی تمام معدنی دولت اسلامی اصولوں کی رُو سے اجتماعی ملکیت کے دائرہ میں آتی ہے اور یہ کہنا صریحاً غلط ہے کہ اسلام میں اجتماعی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ اسلامی نقطۂ نظر سے اجتماعی ملکیت کو بالکل ناجائز قرار دیتے ہیں انھیں اپنے مقدمات کی بنا پر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ریل، ڈاک اور تار وغیرہ کے انتظامات بھی اسٹیٹ کے قبضہ میں نہیں ہونا چاہئیں، کیونکہ یہ تمام چیزیں اجتماعی ملکیت کی تعریف میں آتی ہیں اور ان کا انتظام دوسرے طریقوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض ملکوں میں کچھ زمانہ پہلے ڈاک، تار اور بجلی کی بہم رسانی کا انتظام بھی خانگی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر اجتماعی ملکیت اصولِ اسلام کی رُو سے بالکل ناجائز ہے تو ان امور کے انتظام کو پھر سے افراد کے سپرد کر دینا پڑے گا۔

اجتماعی ملکیت کے مخالفین کی ایک آخری دلیل یہ ہے کہ اسلامی نظام کے تحت خدا پرستی کی تعلیم اور اخلاقی اقدار کی اشاعت سے انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی روش میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد پھر انفرادی ملکیت کے ناجائز اور غلط استعمال کا خطرہ ناپید ہو جائے گا اور لوگ اپنے حقوق ملکیت کو اس طرح کام میں لائیں گے جس

سے سوسائٹی کو نقصان کی جگہ نفع پہنچے گا۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اگر خدا کی حاکمیت اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ انسانی اعمال کا محرک بن جائے تو اس سے اُن کی سیرت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو جائے گا لیکن انسانی اخلاق کی یہ ترقی اور فضیلت جس طرح انفرادی ملکیّت کے اصول کو کامیاب بنا سکتی ہے اسی طرح اجتماعی ملکیّت کے نظام کو بھی درست حالت میں رکھ سکتی ہے جس نظام کے کارکن اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور آخرت کی جزا و سزا پر ایمان رکھتے ہوں وہ یقیناً ان خرابیوں اور ناانصافیوں سے پاک ہوگا جن سے آج اہل دنیا تنگ نظر آتے ہیں۔ لیکن سیرت کی یہ پاکیزگی اور خدا ترسی کی یہ روح دونوں نظامات میں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انفرادی ملکیّت کے تحت تو خدا پرستی کی تعلیم و تربیت مطلوبہ نتائج پیدا کرے گی لیکن اجتماعی ملکیّت کے نظام میں یہی تعلیم و تربیت اُلٹے اثرات کا موجب بن جائے گی۔ اس لیے انفرادی ملکیّت اور اجتماعی ملکیّت کے اصولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں اخلاقی اقدار و مذہبی تعلیم و تربیت کے اثرات سے قطع نظر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ تعلیم و تربیت دونوں نظامات میں یکساں نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہم کمیونزم کے اس دعویٰ کی تردید کرتے ہیں کہ محض اجتماعی ملکیّت کے قیام سے انسانی اخلاق و سیرت کے سانچے بدل جائیں گے یا خانگی ملکیّت کی منسوخی کے ساتھ

ہی تمام آدمی فرشتہ بن جائیں گے اور خود غرضی، نفع پرستی اور دیگر رذائل اخلاق کا وجود دنیا سے مٹ جائے گا۔ اسی طرح ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آخرت کا عقیدہ تمام انسانوں پر یکساں شدت کے ساتھ کارفرما نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو اس عقیدہ سے نیک سیرت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرہ کا ہر فرد ایمان و یقین کے اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے جہاں اس کے اندر سے خود غرضی اور نفس پرستی کے جذبات یکسر مفقود ہو جائیں۔ اس لیے یہ توقع کرنا صحیح نہیں ہے کہ اسلامی تعلیم و تربیت کا وسیع پیمانہ پر انتظام کر لینے کے بعد سوسائٹی کا کوئی شخص انفرادی ملکیت کے حق کا ناجائز استعمال نہیں کرے گا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جو معاشرۂ اسلامی عقیدۂ توحید و آخرت کی روح سے معمور ہوگا وہ کمیونسٹ نظام کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ خیر اور انصاف پیدا کرے گا۔
